مختلف مضامین

۸

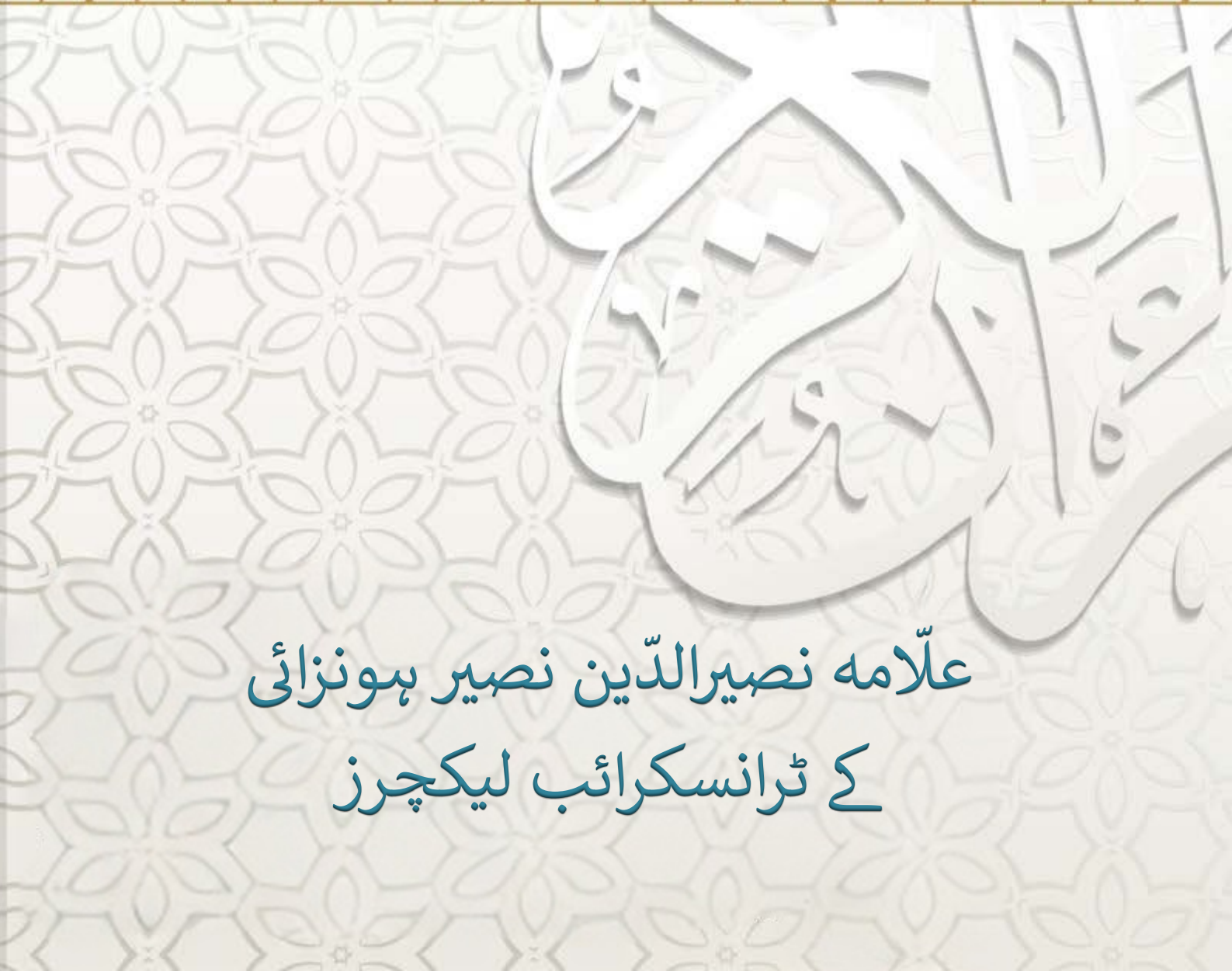

علّامہ نصیرالدّین نصیر ہونزائی

کے ٹرانسکرائب لیکچرز

تمہید

استادِ بزرگوار علامہ صاحب قبلہ نے اپنی صد سالہ عمرِ گرانمایہ میں اپنی زبانِ فیض بار اور قلمِ جواہر نگار سے کتابوں کے علاوہ آڈیو لیکچرز کی صورت میں ایک بیش بہا خزانہ عالمِ انسانیت کے لئے عطا کیا ہے۔ اِن لیکچرز کی اہمیت کے حوالے سے آنجناب خود فرماتے ہیں:

''ہمارے کیسٹوں میں جو تقاریر ہیں وہ بنیادی اور اساسی مواد کا کام دیں گے، یعنی اُن سے اسماعیلی مذہب پر ریسرچ میں بڑی مدد مل سکتی ہے۔ میرے نزدیک ہر کیسٹ کا مواد ایک کتابچہ کی حیثیت رکھتا ہے اور اس میں بڑی اہم باتیں ریکارڈ ہوئی ہیں۔ کیسٹوں کے قیمتی مواد کو محفوظ کر لینا ضروری ہے، کیونکہ یہ ہماری پیاری جمعیت کی دولت ہے، یہ ہمارے علمی سرمایے کا ایک اہم حصّہ ہے، اور ہم کو یقین ہے کہ مستقبل میں ہمارے ان علمی کاموں کی قدر و قیمت میں اضافہ ہونے والا ہے، ہماری تحریروں کے ایک ایک پُرزے پر ریسرچ ہوگی، کیونکہ ہماری نگارشات میں امامِ عالیمقامؑ کی نورانیت و روحانیت براہِ راست کارفرما ہے''۔ (غیر مطبوعہ)

استادِ گرامی قبلہ کی اِس روشن ہدایت کے پیشِ نظر اِن گرانمایہ دُرّ و مرجان کو ضبطِ تحریر میں لانے کا انتہائی اہم اور دقیق کام استاد بحر العلوم صاحب کی سرپرستی میں شروع کیا گیا ہے۔ اور آپ نے اِس سلسلے میں خانۂ حکمت کے تمام سینٹرز میں جا کر اس کام کی اہمیت کے حوالے سے آگاہی اور رہنمائی فرمائی ہے اور ناچیز کو اِن لیکچرز کو تحریر میں لانے اور منظم کرنے کی ذمہ داری دی ہے اس سلسلے میں کئی احباب انتہائی جانفشانی سے کام کر رہے ہیں۔ ان خزائن کو جماعت اور دنیائے انسانیت تک پہنچانے کے لئے محترم مصطفیٰ مومن صاحب نے اسے (ebook) کی صورت میں پیش کرنے میں ہماری مدد فرمائی ہے۔

ناچیز نسرین اکبر

مختلف مضامین - ۱

فہرستِ مضامین

نمبر شمار	مضمون	لیکچر نمبر	صفحہ نمبر
۱	حصول معرفت کے طریقے	۱	۱
۲	وحی	۲	۱۰
۳	دین قانونِ فطرت ہے	۳	۲۰
۴	علم کے بارے میں چند اہم نکات	۴	۲۸
۵	امام نورِ قرآن ہے	۵	۴۱
۶	علمی خدمت کی اہمیت	۶	۴۷
۷	نیت	۷	۵۶
۸	عذاب کی حقیقت	۸ الیف	۶۴
۹	عذاب کی حقیقت، سوال وجواب	۸ ب	۷۲
۱۰	ایمان بالغیب، صفاتِ خداوندی	۹	۸۴
۱۱	انسانی اختیار	۱۰	۹۵

Click here for Audio

استادِ بزرگوار علّامہ نصیر الدّین نصیرؔ ہونزائی (ق س) کا پُرحکمت بیان

عنوان: حصولِ معرفت کے طریقے

کیسٹ نمبر:1 تاریخ:۱۹۷۷، کراچی

انسان میں اللہ تعالیٰ کی تمام قدرتوں اور عجائبات کی انتہا ہے۔خداوندِ عالم نے انسان کو اپنی تمام قدرتوں سے اور اپنے تمام عجائبات سے کام لے کر بنایا ہے اور خدا کی ساری کاریگری انسان کی تخلیق میں استعمال ہوئی ہے۔اس لئے انسان سے بڑھ کر کوئی مخلوق نہیں اور انسان کی خودی میں، انسان کی انا میں، انسان کی ہستی میں سب کچھ ہے، اس لئے انسان جب اپنی خودی کے سمندر میں غوطہ لگاتا ہے تو ہر بار وہ گرانقدر موتیوں کے ساتھ نکلتا ہے۔

انسان کے باطن میں سب کچھ ہونے کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو کہ خدا کی معرفت اور شناخت بھی انسان اپنے باطن ہی سے حاصل کر سکتا ہے، اس لئے انسان کو کامیابی کے لئے کسی اور جگہ نہیں دیکھنا چاہئے بلکہ اپنے باطن ہی کی طرف دیکھنا چاہیے کہ اُس کو گوہرِ مقصود یہیں سے ملنے والا ہے اور کہیں سے نہیں، یہی سبب ہے جو ارشاد ہُوا ہے کہ مَن عَرَفَ نَفسَہٗ فَقَد عَرَفَ رَبَّہ۔ جس نے اپنی ذات کی شناخت حاصل کر لی تحقیق اُس نے اپنے ربّ کو پہچان لیا۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ خداوند تبارک وتعالیٰ کی شناخت یعنی معرفت انسان کے اپنے نفس کی شناخت کے اندر ہے اور پروردگار کی شناخت سے کوئی معرفت باہر نہیں رہتی ہے۔

اگرچہ معرفت ایک لفظ ہے لیکن اس کے اندر تمام معانی آتے ہیں اور سارے مطالب اسی میں سموئے ہوئے ہیں۔اس لئے معرفت سے کوئی چیز باہر نہیں رہ سکتی ہے۔تو یہ انسان کی خودی ہے، یہ انسان کی انا ہے لہٰذا مومن کو ہر وقت اپنے باطن کے سمندر میں غوطہ لگانا چاہیے، اسمیں ڈوبنا چاہئے کہ گوہرِ مقصود اسی ہستی میں اور انسان کے باطن میں پوشیدہ ہیں۔لیکن ایک مومن کس طرح اپنے باطن میں جائے؟ مومن کی باطنی آنکھ کس طرح کُھلے؟ وہ کیسے اِس مقصد میں کامیاب ہو جائے، کہ وہ اپنی انا کی شناخت حاصل کرے جس میں کہ خدا کی شناخت پوشیدہ ہے۔یہ ایک مسئلہ رہا ہے یعنی انسان چاہتا تو ہے کہ اپنی ذات کی شناخت کو جیسا کہ چاہئے حاصل کرے لیکن ہر بار وہ نامُرادی سے دوچار ہو جاتا ہے۔چاہنے کے باوجود، ارادے کے باوجود، وہ ناکام ہو جاتا ہے تو ظاہر ہے کہ وہ ناکام ہو جائے گا جب تک کہ وہ اس کورس کی تکمیل کے لئے وہ ساری باتیں نہ سمجھے، نہ جانے، جنکے بغیر کسی انسان کی معرفت مکمل نہیں ہوسکتی ہے۔اس میں بہت سی باریکیاں ہیں،،بہت سی باتیں ہیں،،بہت سی شرائط ہیں، اِن شرائط کی تکمیل کے بغیر، اِن باتوں کو جانے بغیر انسان اس مقصد میں کامیاب نہیں ہو

سکتا ہے۔

سب سے پہلے مومن کو یہ اندازہ کرنا چاہئے کہ کام کی نوعیت کیا ہے؟ اس کی اہمیت کیا ہے؟ کتنا بڑا کام ہے؟ اور اس کے لئے کتنی کُچھ قربانیوں کی ضرورت ہے۔ سب سے پہلے تو اندازہ کرنا چاہئے، کیونکہ مادی لحاظ سے بھی یعنی دنیوی طور پر بھی ایک دانشمند انسان جب کسی کام کے لئے، کسی بڑے کام کے لئے کوئی منصوبہ بناتا ہے تو وہ ٹھنڈے دل سے سوچتا ہے، غور کرتا ہے کہ اس کام کی تکمیل کے لئے، اِس منصوبے کی تکمیل کے لیے کتنا وقت درکار ہوگا۔ کتنے پیسے لگیں گے اور کتنے آدمیوں سے کام لے کر اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا جائے گا وغیرہ۔ وہ اپنے منصوبے کا تخمینہ لگاتا ہے اور حساب لگاتا ہے اور کسی ماہر شخص سے بھی مدد لے کر اپنے منصوبے کے سلسلے میں خوب سوچتا ہے اور کام کی تکمیل اور اس کی کامیابی کا دارومدار اس بات پر ہے کہ Estimate یا کہ تخمینہ یا کہ اندازہ جن الفاظ میں بھی کہا جائے صحیح ہونا چاہئے اور خوب اُس میں محنت سے کام لیکر سوچنا چاہئے، تب وہ کام مکمل ہو جائے گا اور جو مقصد ہے وہ حاصل ہو جائے گا۔

اس لئے مومن کو سوچنا چاہئے، اگر واقعاً انسان کے اندر ایک دُنیا پوشیدہ ہے، ایک کائنات ہے، روحانیت کی کائنات، باطن کی دنیا اور اس میں سب کچھ ہے، خصوصاً ایک چُھپا ہُوا خزانہ ہے اور جس کا نام خدا ہے تو اِس خزانے کے حصول کے سلسلے میں کتنی محنت درکار ہوگی۔ کتنی مشقت کا اندازہ ہونا چاہئے اور کیسی کیسی قربانیاں درکار ہونگی اور اس سودے میں فائدہ ہے یا نقصان ہے؟ ان تمام قربانیوں کے بعد، اس ساری مشقت کے بعد اگر وہ خزانہ حاصل ہو جائے یعنی خدا کا خزانہ تو آیا اس سودے میں فائدہ ہے یا نقصان، اِن تمام باتوں پر سوچنا چاہئے اور پھر وہ اس میں قدم آگے بڑھائے اور کام شروع کرے اور عقل و دانش اور عدل و انصاف کے تقاضوں کے مطابق اسے ہر قسم کی متعلقہ قربانی پیش کرنے سے دریغ نہیں کرنا چاہئے۔

مثلاً اگر اُسے بعض خواہشات سے دست بردار ہو جانا پڑتا ہے اور بعض عادتوں کی قربانی دینے کی ضرورت ہوتی ہے تو اُسے ایسی قربانیوں سے دریغ نہیں رکھنا چاہئے۔ کیونکہ سودا جو ہے وہ بہت بڑا ہے اور اُس میں بہت ہی فائدہ ہے۔

جیسا کہ ظاہری طور پر ایک بادشاہ ہے، وہ کسی ملک کو فتح کرنے کے لئے منصوبہ بناتا ہے تو پہلے سے وہ سوچتا ہے، دانشمندی سے سوچتا ہے اپنے وزیروں کے ساتھ اور فوج کے اعلیٰ افسروں کے ساتھ سوچتا ہے، میٹنگ کرتا ہے بہت ہی خفیہ طریقے سے کہ اس ملک کو لینے کے لئے کتنے خزانے خرچ ہونگے اور کتنی جانوں کی قربانی درکار ہوگی؟ اور وہ کام کتنا بڑا ہے؟ اور سب کچھ قربان کرنے کے بعد اگر وہ ملک ہاتھ آئے اور اِسکی سلطنت کی توسیع ہو جائے تو اس میں فائدہ ہے یا نقصان، وہ سوچتا ہے۔ وہ اس طرح سے سوچتا ہے کہ اگر کچھ فوج کی بھی قربانی دینی ہو یعنی جانوں کی اور کچھ خزانہ بھی

خرچ ہو جائے اور محنت و مشقت اُٹھانی پڑے اور نتیجہ کے طور پر وہ ملک ہاتھ آئے، اُسکی فتح ہو تو پھر وہ سوچتا ہے کہ کوئی بات نہیں ہے پھر نفوس بھی پیدا ہونگے، خزانے بھی ہاتھ آئیں گے اور ہمیشہ کے لئے اسکے لوگوں کو، اس کے ملک والوں کو، اس کے خاندان والوں کو اور اس کے جانشینوں کو بہت بہت فائدے حاصل ہونے والے ہیں وہ اس طرح سوچتا ہے۔

خیر یہ تو ایک مادی مثال ہے، مادی مثال روحانی حقیقت کے قریب تو جاتی ہے لیکن ہو بہو ترجمانی نہیں کرسکتی ہے، تھوڑی بہت مادی مثال سے ہم کو مدد ملتی ہے لیکن اُس روحانی حقیقت کو جیسا کہ چاہئے پیش نہیں کرسکتی ہے۔ اُس کو Cover نہیں کرسکتی ہے۔ بہرحال بات یہ تھی کہ اگر مومن کے باطن میں جو خزانہ ہے اُس کو حاصل کرنے کے لئے کچھ وقت کی قربانی، کچھ بعض عادتوں سے دستبردار ہو جانے کی قربانی، کچھ محنت مشقت وغیرہ کی قربانیوں کی ضرورت ہو تو دانشمند مومن کو کسی دریغ کے بغیر یہ قربانیاں پیش کرنی چاہئے۔ اسی میں دانشمندی ہے اور اسی میں فائدہ ہے۔ کیونکہ وہ مملکتِ روحانی یعنی روحانی بادشاہی ہے اور وہ خزانہ جس کا نام خدا ہے، بہت ہی اعلیٰ اور لازوال ہے، وہ غیر فانی ہے اِس لئے دانشمندوں نے اِس خزانے کے حصول کے سلسلے میں بہت کچھ کوشش کی ہے اور بہت کچھ انھوں نے مشقتیں اُٹھائی ہیں، بہت سی قربانیاں دی ہیں، جن کے نتیجے میں وہ کامیاب ہو گئے ہیں اور یہ خزانہ ان کے ہاتھ آیا ہے۔

یہ سب کچھ خدا کی رحمت ہے، اُس کی مہربانی ہے کہ ہماری اس مادی زندگی کی بعض کوششوں کے نتیجے میں اُس نے یہ راستہ ممکن بنا دیا ہے کہ مومن اُس تک پہنچے اور اُس خزانے کو حاصل کرلے، ورنہ اگر صحیح قیمت کا اندازہ کیا جائے تو وہ کونسی چیز ہے جو دونوں جہان میں اس خزانے کی قیمت ہو سکے، اِس کے برابر ہو سکے۔ جہاں خداوندِ عالم کے نور کے مقابلے میں کوئی چیز نہیں ہے کہ اُس کی برابری کرے، کہ اُس کا ہم وزن قرار پائے، کہ اُسکا ہم پلّہ ہو، کہ اُس کا ہم رتبہ ہو، ایسی کوئی چیز نہیں ہے۔ لیکن پھر بھی یہ اُس کا اِحسان ہے، یہ اُس کی مہربانی ہے، یہ اُس کی عظیم رحمت ہے کہ اُس نے خود کو پیش کیا ہے، اپنی ہستی کو پیش کیا ہے، اپنی حقیقت کو پیش کیا ہے، اپنی خودی کو سامنے کر دیا ہے اور کہا ہے کہ یہ لو تمھارا سب سے بڑا انعام دین میں یہی ہے کہ تم مجھ ہی کو لو، جنت اور روحانی سلطنت ایک معمولی بات ہے، تم خدا کو لو، اُس خزانے کو لو جو خدا کے نام سے ہے۔

میں نے اس نکتہ میں بہت سوچا ہے، یعنی ''خدا کی معرفت'' کے سلسلے میں جو حدیثِ قدسی ہے کہ: کُنتُ کنزاً مخفیّاً فاحببتُ ان اُعْرَفَ فخلقتُ الخلق۔ میں ایک چُھپا ہوا خزانہ تھا، مجھ کو یہ بات اچھی لگی، میں نے چاہا، میں نے پسند کیا کہ میری شناخت ہو، مجھ کو پہچانا جائے، اِس کے لئے میں نے کائنات بنائی، مخلوقات پیدا کی، انسان کو بنایا اُس کی جسمانی تخلیق کے بعد روحانی تخلیق مکمل کر دی تا کہ روحانی تخلیق کی تکمیل کے بعد انسان یعنی مومن میری شناخت کی طرف لپکے، آگے بڑھے۔

اس حدیثِ قدسی کے اندر جو اِشارے ہیں وہ بہت ہی عجیب وغریب ہیں اور اس کا طرزِ بیان بھی بہت ہی عجیب ہے، بہت ہی نرالا ہے، بہت ہی اعلیٰ ہے، بہت ہی شان والا ہے یہ بیان، اور وہ یہ کہ خداوندِ عالم نے قرآنِ مقدس میں جہاں جہاں بہت سے ناموں کے ساتھ خود کو پیش کیا تھا کہیں رحمان ہے، کہیں رحیم ہے، کہیں کریم ہے، کہیں علیم ہے، کہیں سبحان ہے، کہیں قہار بھی ہے، جبّار بھی ہے، مختلف قسم کے ناموں کے ساتھ اُس نے خود کو پیش کیا تھا لیکن یہاں آ کر اُس نے خود کو ایک خزانہ قرار دیا۔ جاننے والا ہی جانتا ہے اس حکمت کو کہ اس میں خدا کا اظہارِ رحمت ہے، بہت بڑی رحمت ہے اور خلاصہ یہ ہے کہ خداوندِ عالم یہ کہنا چاہتا ہے، یہ سمجھانا چاہتا ہے کہ جب کبھی مومن خدا کو صحیح معنوں میں پہچان لے گا تو اُس وقت خدا ایک بادشاہ کی حیثیت سے سامنے نہیں آئے گا، معبود کی حیثیت سے سامنے نہیں آئے گا، مالک کی حیثیت سے سامنے نہیں آئے گا، اور کسی زبردست نام کے ساتھ سامنے نہیں آئے گا جس کا تقاضا حکمرانی ہو، جسکا تصور بادشاہی ہو بلکہ وہ ایک خاموش خزانے کی حیثیت سے سامنے آئے گا۔

کتنی عظیم رحمت ہے اِس ارشاد میں جو فرمایا گیا کہ خدا معرفت کی چوٹی پر خود کو ایک خزانہ قرار دیتا ہے، چُھپا ہُوا خزانہ، بھیدوں کا خزانہ، اسرار کا خزانہ، حکمتوں کا خزانہ، اعلیٰ سے اعلیٰ علم کا خزانہ، ایسے بھیدوں کا خزانہ جن کو عارفِ ربّانی کے سوا کوئی نہیں جانتا، اسی لئے حدیثِ قدسی میں خدا نے فرمایا ہے کہ ''انسان میرا بھید ہے اور میں اُس کا بھید ہوں''۔ انسان خدا کا کیا بھید ہے؟ خدا انسان کا کیا بھید ہے؟ خدا اور انسان کا آپس میں کیا رشتہ ہے؟ انسان خدا کا کیا لگتا ہے،؟ خدا اور بندے کے درمیان کیا نسبت ہے،؟ روح کی کیا اصلیت ہے،؟ روح کب پیدا ہوئی اور کب فنا ہو جائے گی؟ یا روح کوئی غیر فانی حقیقت ہے؟ کیا بات ہے؟ یہ ساری حقیقتیں معرفت کے مقام پر منکشف ہو جاتی ہے۔ یہ تشریح ہے اِس بات کی کہ خدا معرفت کا خزانہ ہے۔

جس دن پروردگارِ عالم چُھپے ہوئے خزانے کی حیثیت سے مومن کو ملے گا تو اُس دن خدا معبود، بادشاہ، مالک، آقا، ایسے ناموں سے نہیں ملے گا یہ نام بہت پیچھے رہ جائیں گے۔ بلکہ خدا مومن کو وحدت و یگانگت اور خودی کے طور سے ملے گا، بلکہ اس راز سے پردہ ہٹایا جائے گا کہ انسان خود ہی وہی حقیقت ہے جس کی پرستش وہ آج خدا کے نام سے کرتا ہے۔ یا ایک عام مثال میں یوں سمجھنا چاہئے کہ اُس وقت بندۂ مومن کو یہ معلوم ہو جائے گا کہ منصور حلاج نے کیوں انا الحق کہا تھا؟ البتہ اُس کے انا الحق کہنے کے کچھ معنی تھے اور وہ معنی یہی ہیں کہ انسان اپنی روح کی انتہائی بلندی میں خدا سے مل کر ہے، یعنی کہ انسان خدا ہے۔

یہ بات اگرچہ ایک حقیقت ہے لیکن اس موقع پر، اِس حالت میں جس میں کہ ہم رہتے ہیں اتنی بھاری لگتی ہے کہ بعض دفعہ انسان گھبرا جاتا ہے اور بہت سے شکوک پیدا ہو جاتے ہیں کہ انسان خدا ہے؟ کیسے خدا ہے؟ اتنی کمزوریوں اور

خامیوں کے باوجود؟ ہاں اِس حقیقت کے زور سے جو اب اِس وقت ہمارے سامنے ہے، ہم کہہ سکتے ہیں کہ **انسان اپنی روح کی انتہائی بلندی پر خدا ہے**۔ اِس میں بہت سی وضاحت اور بہت سی تشریح کی ضرورت ہے اس کے بغیر اِس بیان کی حقیقتیں سمجھ میں نہیں آتی ہیں اور ہم اِس سلسلے میں اپنے امام عالی مقام کے ارشادات سے بھی مدد لیتے ہیں۔

امام سلطان محمد شاہؑ نے روح کی آزادی کے عنوان پر ایک طویل فرمان فرمایا ہے، اس ارشاد میں امام اس بات پر زیادہ سے زیادہ زور دیتے ہیں کہ جب تک مومن روح کی آزادی حاصل نہ کرے تب تک مطلب پورا نہیں ہوگا۔ وہ مثال دیتے ہوئے فرماتے ہیں" آپ کا کوئی غلام ہو اور وہ اچھا انسان ہو اور ہمیشہ آپ کی خدمت کرتا ہو تو آپ اس کے لئے کیا کریں گے؟ اسے پیسے دیں گے تو وہ خوش نہیں ہوگا، اُسے آزاد کریں گے تب ہی وہ خوش ہوگا"۔ (دارالسّلام، ۲۹ ستمبر۔ ۱۸۹۹)

ایک غلام کو ایک مہربان آقا نوازتا ہے اور بہت کچھ نوازتا ہے تو اگر غلام دانا ہے تو وہ خوش نہیں رہے گا، اگر نادان ہے تو وہ خوش ہو جائے گا اِس لئے کہ اگر آقا اُس غلام پر مہربان ہو جانا چاہتا ہے تو اُس کو آزاد کرے، یہ اس کا سب سے بڑا انعام ہے، بڑی مہربانی ہے اور یہ اتنی بڑی مہربانی ہے کہ دیگر نوازشات اِس مہربانی کے مقابلے میں ہیچ ہیں، کچھ معنی نہیں رکھتیں، ایک غلام پر آقا جتنی بھی مہربانیاں کرے وہ کچھ بھی نہیں اُس مہربانی کے مقابلے میں جس میں کہ وہ اُس کو آزاد کر دیتا ہے۔

آخر سمجھنا چاہئے کہ امامؑ اِس سے کیا چاہتے ہیں، کونسی آزادی چاہتے ہیں، کیا وہ ایسی آزادی چاہتے ہیں کہ ہم بس جو بھی جی چاہے دنیا میں کر گزریں یا یہ کہ صرف نظریات کی آزادی ہے، روحانی آزادی ہے۔ یہ روحانی آزادی ہے، لیکن اس کے لیے ایک صحیح مقام ہے ہم محض فلسفے سے خود کو آزاد نہیں کرا سکتے ہیں اور وہ آزادی ہم حاصل نہیں کر سکتے ہیں جس کا امامؑ ذکر فرماتے ہیں، اس کے لئے عمل کی ضرورت ہے، محنت اور ترقی کی ضرورت ہے۔

جب تک ہم عرفان کے سلسلے میں، روحانیت کے سلسلے میں اُس مقام کو نہ پہنچیں گے جس میں کہ گنجِ مخفی ملتا ہے، جہاں پر کہ چھپا ہوا خزانہ ہاتھ آتا ہے تو پھر ہم اپنے فلسفے کے زور سے خود کو آزاد نہیں کرا سکتے ہیں، اگر ہم فلسفے کو بیان کرتے ہیں تو اُسکی مُراد یہی ہے کہ ہم عبادت و معرفت میں آگے بڑھیں۔ یہ بیان محض اس لئے ہے کہ ہمارے سامنے جو منصوبہ ہے یا جو روحانیت کا سودا ہے، اُس کی اہمیت ظاہر ہو جائے، اُس کی قدر و قیمت معلوم ہو جائے، اسی مقصد کے لئے ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ ہم اِس مقام پر ہی اِس فلسفہ کو سمجھیں اور بس بیٹھیں، میں یہ ہرگز نہیں چاہتا ہوں، میں صرف یہ یقین دلانا چاہتا ہوں کہ جو عبادت ہے، جو ریاضت ہے اور جو روحانیت کا سودا ہے وہ بہت ہی عظیم ہے۔ وہ بہت ہی عظیم ہے، اِس کے لئے عمل کی ضرورت ہے، قربانیوں کی ضرورت ہے اور یہ بیان اِس لئے بھی ہے کہ کام سے دلچسپی اُس وقت زیادہ سے زیادہ ہو جاتی جب کہ ہم کام کی اہمیت کو سمجھتے ہیں، جبکہ ہم اس کی قدر و قیمت کو سمجھتے ہیں۔

ہمارے پیر، بزرگوں نے اور ہمارے اماموں نے ایک عنوان دیا ہے، ایک اصطلاح دی ہے وہ ہے ''بڑا کام''، بڑا کام کتنا بڑا کام؟ سمجھنا بھی تو چاہیے صرف بڑا کہنے میں کچھ مطلب حاصل نہیں ہوتا ہے۔ بڑے اور بڑے میں فرق ہے کتنا بڑا؟ کائنات وموجودات کے برابر یعنی آسمان زمین کے برابر یا اِس سے بھی بڑا۔ میں تو یہ کہوں گا کہ اِس سے بھی بہت بڑا، دنیا اور آخرت ملا کر اِس کے برابر؟ اِس سے بھی بہت بڑا اور آخر میں خدا کے برابر۔ خدا کے برابر اس معنی میں نہیں کہ خدا کے سوا کوئی اور چیز ہے جو خدا کے برابر ہے بلکہ صرف اِس معنی میں کہ بڑے کام سے مُراد خدا ہے اور آپ اللہ اکبر میں یہی کہا کرتے ہیں کہ خدا سب سے بڑا ہے تو اِس کام میں آپ کو اللہُ اکبر کی تلاش ہے یعنی سب سے بڑی حقیقت کی تلاش ہے اور سب سے بڑے خزانے کی تلاش ہے اور سب سے بڑے جو خداوند ہیں اُس کی تلاش ہے۔ یہ بڑا کام اتنا بڑا ہے، یہ بڑا کام اتنا عظیم ہے۔

اس لئے سمجھنا چاہیے کہ مومن کے سامنے جو منصوبہ ہے وہ کتنا بڑا ہے، آپ نے لیا ہے، یا لینے والے ہیں یا سوچتے ہیں کچھ بھی ہو، ہمارے مذہب میں تو یہ ایک اہم کام ہے۔ گویا فرض، گویا خوشی کی چیز ہے، مرضی کی چیز ہے، ہر حالت میں اِس سے آپکا ہمارا واسطہ ہے، تعلق ہے لہٰذا ہمیں اس کے بارے میں بہت کچھ سمجھنا چاہئے۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبروں نے جو کامیابی حاصل کی یا جو فضیلت اُن کو حاصل ہوئی یا جو چیز اُن کو ملی وہ اسی بڑے کام کی بدولت سے ملی اور یہاں تک کہ نبوت کا معجزہ اور امامت کی شان بھی اِس میں ہے یا یوں کہنا چاہئے کہ امامت کا جو راز ہے وہ بھی اِسی میں ہے۔

جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ اس کائنات کے قائم ہونے کا کوئی بھید ہے جو کہ سائنسدان (نہیں سمجھتے ہیں کہ) کس طرح دنیا قائم ہے؟ کسطرح یہ عظیم کائنات ٹھہری ہوئی ہے؟ اِس کو نہیں سمجھتے ہیں اور ان کو نہ سمجھنے کا احساس بھی نہیں ہے۔ احساس اُن کو ہے جو خدا کی ہستی پر یقین رکھتے ہیں اور اُن کو احساس نہیں ہے جو خدا کی ہستی سے منکر ہیں۔ جو لوگ خدا کی ہستی سے منکر ہیں وہ سوچ ہی نہیں سکتے ہیں کہ اس کائنات کا کوئی بھید ہے اِسی طرح دین کی تمام حقیقتوں اور دین کی تمام گرانقدر باتوں تک رسا ہو جانے کا دارومدار یہی بڑا کام ہے۔ یہاں تک کہ آدم کا قصہ بھی اسی میں آتا ہے، تو کوئی چیز اس سے باہر نہیں ہے۔

میں معرفت کی بات کرتا تھا اور تشریح کرتے کرتے یہاں تک آیا تاہم میں اسی Subject کے مرکز کے گرد اگرد گھومتا ہوں اور اس سے باہر نہیں جا رہا ہوں۔ یہی ایک موضوع ہے جو معرفت کا موضوع ہے، جو گنجِ مخفی کا موضوع ہے۔ تو گنجِ مخفی یعنی چھپے ہوئے خزانے کے بارے میں آپ کبھی سوچیں، فراغت میں سوچیں کہ خدا نے کیوں خود کو خزانہ قرار دیا اور خدا نے معلوم نہیں کس مصلحت کے تحت ایک طرح سے اپنی شان گھٹا دی، کہ گنج یعنی خزانے میں تو سونا ہوتا ہے، چاندی ہوتی ہے، جواہر ہوتے ہیں، قیمتی اشیاء ہوتی ہیں، جنکو فروخت کیا جاتا ہے یا تبادلہ ہوتا ہے، Exchange ہوتا ہے۔

تو خدا نے اپنی ہستی کی تشبیہہ و تمثیل ایسی مادی چیزوں سے کیوں دی؟ حالانکہ ہر بار آپ دیکھیں گے کہ جب خدا اپنی تعریف و توصیف کرتا ہے تو اُس وقت اکثر دنیا کی مثالوں سے احتراز کرتا ہے۔ دنیا کی چیزوں سے اپنی ذات کو برتر قرار دیتا ہے اور یہ حقیقت ہے لیکن اس مقام پر خدا نے اپنی شان کو گھٹا کر سونے سے چاندی سے تشبیہہ دی، جواہرات سے اور قیمتی اشیاء سے اپنی ذات وصفات کی تشبیہہ دی تو آخر اِس کا کوئی مقصد ہوگا۔ وہ مقصد یہی ہے جو میں نے آپ سے کہا کہ خداوندِ عالم بالکل اسی طرح اپنی حقیقتوں کو، اپنے بھیدوں کو عارفِ کامل کے سپرد کر دینا چاہتا ہے وہ یہ کہنا چاہتا ہے۔ کہ اب تک جو چلا تھا وہ ایک راز کے تحت چلا تھا، ایک بھید کے ذریعہ سے چلا تھا، اب وہ بھید میں کھول دیتا ہوں وہ یہ کہ ''تو اور میں ایک ہیں'' یہ تو ترجمانی کے طور پر ہے، ایک ہی حقیقت ہے، ایک ہی اصلیت ہے، جو ازل میں اور ابد میں ایک ہی ہے۔ اُس میں دوئی کا نام ونشان ہی نہیں، بس ایک ہی ایک ہے اور اُس ایک میں سے دو کا ہونا اِس قدر ناممکن ہے جس طرح کہ دنیا میں جَو سے گندم اور گندم سے کبھی جَو پیدا نہیں ہوتا۔ توحید سے دوئی کسطرح پیدا ہو سکتی ہے۔

حکماء نے کہا ہے کہ **لاتلد الوحدۃ اِلّا الوحدۃ** (وحدت صرف وحدت ہی کو جنم دیتی ہے)۔ لوگ **قل ھو اللہ** یعنی سورۂ اخلاص کے ظاہر کو دیکھ کر بڑا فخر کرتے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ اُن کو سورۂ اخلاص کے ظاہر سے بہت بڑا راز مل گیا جہاں پر کہ خدا نے ارشاد فرمایا کہ:

قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌo اَللّٰہُ الصَّمَدُo لَمْ یَلِدْ وَ لَمْ یُوْ لَدْo وَ لَمْ یَکُنْ لَّہٗ کُفُوًا اَحَدٌo کہیے کہ وہ اللہ ایک ہے، وہ بے نیاز ہے، کسی چیز کی اُسے حاجت نہیں وہ کسی سے پیدا نہیں ہوا اور نہ اُس سے کوئی پیدا ہوا، اس سے کوئی پیدا نہیں ہوا، اس کو کسی نے جنم نہیں دیا۔

اب یہ صرف جسمانی تولید اور جسمانی جنم کا اسمیں ذکر نہیں ہے، اسکے علاوہ بھی ہے وہ یہ کہ لوگ جو سمجھتے ہیں کہ خدائے واحد سے اتنی بڑی کائنات اور اتنے سارے لوگ پیدا ہو گئے، یہ ان کی دانش کی غلطی ہے۔ خداوندِ عالم اس سورۂ اخلاص میں اِن باتوں کی نفی کرتا ہے۔ اس نظریے کی تردید کرتا ہے کہتا ہے کہ اب بھی توحید ہے، اب بھی وحدت ہے اور دوئی کب پیدا ہوئی؟ کسی کا یہ خیال کہ خدا سے اتنی ساری مخلوقات پیدا ہوئیں، ایسا ہے جیسا کہ خدا کے متعلق یہ سوچنا کہ وہ والدین سے پیدا ہوا ہے یا اس سے بچے پیدا ہوئے ہیں۔

جسطرح خدا کے متعلق یہ سوچنا ایک نازیبا خیال ہے، نازیبا تصور ہے کہ خدا کسی کا باپ ہو اور خدا کسی کا بچہ ہو، اسی طرح یہ سوچنا بھی ایسا ہی ہے جو ہم سمجھیں کہ خدا میں اور روحوں میں دوئی ہے، دوئی نہیں ہے بلکہ حقیقت میں وحدت ہی وحدت ہے۔ پھر آپ سوال کریں گے کہ یہ سب کچھ کیا ہے؟ یہ سب کچھ جلوے ہیں، یہ سب کُچھ ظاہری چیزیں ہیں، یہ سب کچھ نظر کے لئے فریب کی چیزیں ہیں۔ دنیا میں آپ کو بہت سی چیزیں ملیں گی جو لگتی ہیں کہ وہ کچھ ہیں، لیکن حقیقت کی نگاہ

سے دیکھا جائے تو انکی ہستی ہی نہیں ہے۔

جب آپ گاڑی میں کہیں جاتے ہیں اور دائیں بائیں دیکھتے ہیں تو زمین درخت اور ہر چیز دوڑتی ہوئی نظر آتی ہے، یہ نظر کا دھوکا ہے۔ جب آپ سورج کی طرف دیکھتے ہیں تو وہ ایک بٹن کے برابر چیز نظر آتی ہے، یہ نظر کا فریب ہے، حقیقت کچھ اور ہے۔ جب آپ آنکھ اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھتے ہیں تو آپ کو یوں لگتا ہے کہ آسمان کے کنارے زمین پر رکھے ہوئے ہیں جسطرح کوئی برتن زمین پر، فرش پر یا کسی چیز پر اُلٹا رکھا جاتا ہے، دیگچہ یا پلیٹ اور تھالی وغیرہ، یہ نظر کا فریب ہے کہ آسمان اسطرح سے نہیں ہے۔ جب آپ دیکھتے ہیں تو آپ کو نیلا نیلا آسمان نظر آتا ہے، یہ نظر کا فریب ہے، آسمان نیلا نیلا نہیں ہے۔

جب آپ دیکھتے ہیں تو آسمان میں ستارے جڑے ہوئے نظر آتے ہیں، چاند بھی، یہ نظر کا فریب ہے۔ جب آپ کسی پہاڑی علاقے میں جائیں گے تو آپ کو لگتا ہے کہ آسمان جو ہے وہ پہاڑوں کے اوپر رکھا ہوا ہے اور پہاڑوں کی چوٹیاں نیزوں کی طرح تیز اور چُبھنے والی نظر آتی ہیں یہ نظر کا فریب ہے۔ آپ پہاڑ کی چوٹی پر جائیں گے تو آسمان اتنا اونچا لگے گا، جتنا کہ زمین سے پہاڑوں تک دیکھا تھا اور وہ چوٹیاں جو آپ کو چبھنے والی نظر آتی ہیں وہ ایسی نہیں ہیں۔

بہر حال نظر کے فریب کے سلسلے میں اس مختصر مثال سے آپ بہت سی باتیں سمجھ سکتے ہیں۔ یہ سب نظر کا فریب ہے، دھوکہ ہے اس کو نظر فریبی کہتے ہیں اور اس کو اِلتباسِ نظر بھی کہتے ہیں۔ یہ نفسیات کی ایک اصطلاح ہے۔ بعض دفعہ آپ آنکھوں کے نیچے انگلیوں سے Pressure ڈال کر دیکھیں کسی چیز کی طرف یا ویسے دیکھیں آپ کی جو دونوں آنکھیں ہیں اِن کے اندر خاصیت یہ ہے کہ دونوں کا جو Action ہے اُس کے اندر Unity ہو جاتی ہے دو آنکھوں سے آپ ایک انسان کو دو نہیں دیکھتے ہیں، ایک دیکھتے ہیں لیکن کبھی آنکھوں میں نقص پیدا ہو تو آپ چیز کو دو بھی دیکھ سکتے ہیں۔ یہ نظر کا نقص ہے وہ چیز یا کہ آدمی دو نہیں ہیں۔

اسی طرح مخلوق جو ہے یہ ایک ایسی چیز ہے جو باہر سے کثرت رکھتی ہے اور اندر سے وحدت رکھتی ہے، اس کے اندر وحدت ہے، یعنی ایک مقام پر ہماری روحوں کی ایک Unity ہے وہ Unity ایسی ہے کہ اس میں ہم سب ایک ہیں۔ جس طرح اب اس صورت میں، اِس حالت میں ہم الگ الگ ہیں لیکن توحید کے مقام پر جا کر دیکھیں تو ہم ایک ہیں۔ اور اگر ہم باور کرتے ہیں کہ ہماری روحوں کی ایک Unity ہے، تو اسی طرح خدا کے ساتھ بھی ہماری ایک Unity ہے، خدا کے ساتھ ہماری Unity کیسی ہے اس کو سمجھنے سے پیشتر انسانوں کی Unity کو سمجھ لیا جائے۔ اگر ہمیں مادی چیزوں کی مدد سے Unity کو سمجھنا ہے تو بزرگوں نے اسکی مثال اس طرح سے دی ہے کہ رات کے وقت اس کمرے کے اندر فرض کریں دس ، بارہ، بیس، تیس بلب جلتے ہیں اور نتیجے کے طور پر دیکھا جائے تو Light یعنی روشنی ملی ہوئی ہے اور بلب جو ہیں وہ الگ

الگ ہیں۔تواب اِس مثال میں دو چیزیں ہمارے سامنے آگئیں،ایک Light ہے جہاں پر Unity ہے اور ایک بلب ہیں جو بہت سارے ہیں۔

پھر مولائے روم کہتے ہیں کہ انگور کے ایک گچھے کو لیں آپ، دیکھیں کہ گچھے،خوشے کی کیفیت کیا ہے؟اسکی ایک تقسیم ہے،اُس کے الگ الگ دانے ہیں۔ہوسکتا ہے کہ کسی دانے کے اندر رس بہت میٹھا ہو اور کسی میں کم میٹھا اور کسی دانے میں رس کھٹا بھی ہو لیکن آپ اس کو نچوڑیں اور ایک برتن کے اندر رس کو جمع کریں۔اب دونوں کی Unity ہوگئی۔جب انگور کے خوشے کی تکمیل ہو رہی تھی،اُس وقت جو پانی،جو قوت،جو Energy آرہی تھی وہ ایک سرچشمے سے آرہی تھی لیکن دونوں میں یہ چیز تقسیم ہوگئی اور تقسیم ہونے کے بعد آپ اُس کو ایک کرسکتے ہیں۔اسی طرح ہماری روح ایک سرچشمے سے آئی ہے،اس کا سرچشمہ ایک ہی ہے۔

قرآن کے اندر ایک آیت ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ:''تمہاری پہلی بار کی تخلیق اور آخری بار کا جِلانا مرنے کے بعد وہ ایک جان کی طرح ہے (۳۱:۲۸)۔''مطلب یہ کہ ہم نفس کل میں ایک ہیں، ہم نفس کل میں ایک تھے اور جب دوبارہ نفس کل کے مقام پر پہنچ جائیں گے تو پھر ایک ہو جائیں گے۔جب ہم نے مخلوق کی مثال میں کثرت دیکھی اور وحدت بھی دیکھی تو اسی طرح ہم ربّ کے درجے میں بھی اپنی Unity کو سمجھ سکتے ہیں،اپنی وحدت کو کہ ہم کس طرح اُس کے ساتھ ایک ہیں،اور کیونکر ہم اُس سے الگ ہو گئے۔تو یہ دونوں باتیں ہیں،جب دونوں باتیں ہیں تو ایک بات ظاہر میں رہے گی اور ایک بات باطن میں جائے گی،وہ یہ کہ ہم ظاہر میں خدا سے الگ ہیں اور باطن میں اُس کے ساتھ ایک ہیں یا اِس کو باطن کا باطن کہنا چاہیے۔اس لئے کہ ہماری وحدت سب سے پہلے آپس میں ہوگی اور اس کے بعد خدا کے ساتھ وحدت ہوگی،اور اس سلسلے میں یہ مثال ہے۔آپ اس لفظ کو سمجھیں کہ کثرت کسے کہتے ہیں یعنی ایک سے گزر کر بہت زیادہ ہو جانا۔ الگ الگ ہونا مختلف حیثیتوں میں ہونا،زیادہ ہونا،یہ کثرت ہے جو وحدت کے مقابلے میں ہے،وحدت کسی حقیقت کا ایک ہونا،تو یہ جو مخلوق ہیں یہ مخلوق وحدتِ کثرت نما ہیں۔یہ لفظ آپ یاد کریں،نوٹ کریں وحدتِ کثرت نما۔ایک ایسی وحدت جو باہر باہر سے کثرت نظر آتی ہے اور اندر سے یہ وحدت ہے۔

ٹائپ:اکبر علی
پروف:نسرین اکبر

استادِ بزرگوار علّامہ نصیر الدّین نصیرؔ ہونزائی (قس)

کا پُرحکمت بیان

Click here for Audio

عنوان: وحی

کیسٹ نمبر: ۲ تاریخ: ۱۹۷۷ء

مقام: کراچی دورانیہ: ۶۰ منٹ

اَب ہم مناجات و گریہ وزاری سے فارغ ہوئے یہ ہمارے باطن کی صفائی کے لئے، پاکیزگی کے لئے تھی۔ ہم نے گویا ہاتھ مُنہ دھولیا اور علم کی بندگی کے لئے تیار ہوئے۔ خداوندِ عالم کی توفیق اور یاری سے ہم آپ کو وحی کی کچھ باتیں بتاتے ہیں، یعنی ہمارا موضوع ہے "وحی"۔ اس سلسلے میں ہم آپ کو کچھ معلومات فراہم کریں گے اور وہ معلومات بنیادی قسم کی ہوں گیں۔

<u>لفظِ وحی کی وضاحت اور اِس کے مختلف اسماء و اصطلاحات:</u>

سب سے پہلے، مَیں یہ گزارش کروں گا کہ ہمارے مقدّس مذہب کی تعلیمات بنیادی قسم کی ہوتی ہیں یعنی بنیادی اہمیت کی حامل ہوا کرتی ہیں اور آپ جانتے ہیں کہ بنیادی تعلیمات کی کیا اہمیّت ہے۔ بنیادی حقیقتیں کس قدر ضروری ہیں اور اُن سے کیا فائدہ ہوتا ہے۔ اُن سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ اگر بنیادی قسم کی باتیں ہم کو بتادی جائیں تو اُس سے ہماری تمام تعلیمات کی اصلاح ہو جاتی ہے یعنی اگر ہم میں کچھ غلط باتیں آگئی ہیں کسی طرح سے اِس دنیا میں رہنے کی وجہ سے اہلِ ظاہر کے درمیان زندگی گزارنے کی وجہ سے یا دُوسروں کی کتابیں پڑھنے کے سبب سے ہم میں جو غلط قسم کے نظریات آگئے ہیں یا ہمارے دل و دماغ میں جو باطل قسم کی باتیں بیٹھ گئی ہیں تو اُن کا اِزالہ اِس طرح سے ہو سکتا ہے کہ ہم اسماعیلیت کی بنیادی تعلیمات میں جائیں اور دوسری بات اِس میں یہ ہے کہ بنیادی تعلیمات کے ہونے سے علم بہت آسانی کے ساتھ آگے بڑھتا ہے اور ہمارے لئے کوئی اُلجھن باقی نہیں رہتی۔

اِس کی مثال یوں ہے کہ کسی بستی کی کوئی نہر ہے اُس میں سے پانی آتا ہے لیکن وہ پانی بڑا ناصاف اور گندا ہے۔ اِس کے لئے کرنا یہ چاہئے کہ ہم جائیں ندی کی طرف لازمی بات ہے کہ ندی میں پانی صاف ہوگا اور گندگی درمیان سے پیدا ہوئی ہوگی۔ اِس لئے ہم جائیں اُس سرچشمے تک یا اُس ندی تک جہاں پر نہر ختم ہو جاتی ہے۔ وہاں جائیں اور وہیں سے پانی پئیں، نہائیں، دھوئیں اور پانی کا تجزیہ کریں، دیکھیں کس قدر پانی صاف ہے، یہی مثال علم کی بھی ہے کہ علم دنیا کے بہت سے لوگوں سے ہو کر جو ہم تک آیا ہے اُس میں آلودگی ہوگئی ہے، اُس میں آلائش ہے۔ علم کا یہ پانی جو بہت سے لوگوں سے ہو کر ہم تک پہنچا ہے بڑا ناصاف ہے، ہمیں اِس کو استعمال نہیں کرنا چاہیے، اگر ہم لباس دھونا چاہیں تو ہمارے لباس دُھل جانے کے بجائے اور زیادہ آلودہ ہو جائیں گے۔ اگر ہم اِس میں نہانا چاہیں تو ہمارے جسم کی پاکیزگی نہیں ہوگی، اگر ہم پینا چاہیں تو یہ پانی پینے کے قابل نہیں ہے اور اگر ہم غذا بنانے کے لئے استعمال کریں، تو یہ صحیح نہیں ہے ہماری صحت بگڑ جائے گی۔

اِس لئے پہلے تو ہمیں چاہئے کہ اِس نہر کے کنارے کنارے چلے جائیں اور دیکھیں کہ پانی کہاں سے آتا ہے۔ اُس سرچشمے تک پہنچیں، اُس ندی تک جائیں، جہاں پر نہر کا وہ سرا ختم ہو جاتا ہے۔ کتنی خوشی کی بات ہے اور کتنی اچھی مثال ہے، بہت ہی دل نشین، دل پذیر، پسندیدہ مثال، بہت ہی آسان کہ اِس سے مومن کی عقل چمک جاتی ہے، اِس سے مومن کو خوشی حاصل ہوتی ہے۔ اِس مثال سے میری مُراد وہ علم ہے جو رُوحانی ہے، جس کو علمِ لدّنی کہا جاتا ہے، جس کو رُوحانی علم کہا جاتا ہے۔ اِس کے صرف دو نام نہیں ہیں اِس کے بہت سے نام ہیں ہر قوم کے نزدیک اِس کا ایک نام ہے اِس سرچشمے کا، اِس علم کا، جس کی مثال میں نے پیش کی۔ صوفیوں کے پاس اِس کے الگ نام ہیں، اسماعیلیوں کے نزدیک اِس کے الگ نام ہیں، اہلِ ظاہر یعنی اہلِ شریعت کے پاس اِس علم کے جو سرچشمے سے ابھی ابھی تازہ تازہ نکلتا ہے الگ نام ہیں۔ اہلِ ظاہر کے نزدیک اِس کو وحی کہا جاتا ہے، اہلِ ظاہر کے نزدیک اِس کا نام وحی ہے اور اِلہام ہے، اِلقا ہے۔ ہمارے نزدیک بھی اِس کا نام وحی، اِلہام اور اِلقا ہو سکتا ہے لیکن ہمارے بزرگوں نے مصلحتہً اِن الفاظ کو زیادہ استعمال نہیں کیا ہے، کیونکہ اِن الفاظ کے استعمال کرنے سے اہلِ ظاہر چڑ جاتے ہیں، وہ ناراض ہو جاتے ہیں کہتے ہیں کہ وحی پیغمبروں کے لئے مخصوص ہے، اِلہام اولیاء کے لئے اور مومنین کے لئے یہ درجہ حاصل نہیں ہے وہ یوں خیال کرتے ہیں۔

تو اِس کے لئے یا تو ہمیں جواب دینا چاہیے یا اِن الفاظ کو اور اِن اصطلاحات کو چھوڑ کر دوسرے الفاظ سے اپنے مطلب کو ادا کرنا چاہیے اور ہمیں کام کرنا چاہیے، ہمیں دُوسروں سے بحث کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، ہمیں زیادہ سے زیادہ کام کرنا چاہیے، اِس لئے ہمارے بزرگوں نے دُوسرے الفاظ اختیار کئے۔ اِس علم کو علمِ تائید کہا جاتا ہے اور رُوحانی علم کہا جاتا ہے، اِس کو رُوحانیت بھی کہا جاتا ہے، نُورانی ہدایت بھی اسی کا نام ہے، آپ اِس کو توفیق بھی کہہ سکتے ہیں۔ الغرض

یہ کہ بہت سے نام ہیں مگر حقیقت ایک ہے اور اگر فی الوقت اِس کے لئے کوئی جواب مہیا کرنا ہے جو اہلِ ظاہر نے سوال اٹھایا کہ وحی اور اِلہام وغیرہ انبیاء و اولیاء کے لئے مخصوص ہیں تو ہم بھی مانتے ہیں۔ وحی اُس معنی میں جس میں کہ لوگوں کو پیغام دینا چاہیے اور کہنا چاہیے کہ میں اللہ کا رسول ہوں بیشک ایسی وحی، اِس معنی میں پیغمبروں کے لئے مخصوص ہے، لیکن ذاتی وحی تو ہر وقت ہوسکتی ہے۔ علم کے معنی میں، ہدایت کے معنی میں اور توفیق کے معنی میں، روشنی کے معنی میں، نُور کے معنی میں اور بھی بہت سے معنوں میں یہ علم آسکتا ہے۔

<u>خدا کی دوستی/خدا کی نزدیکی اور بنیادی علم:</u>

صوفی لوگ اِس کے قائل ہیں کہ وحی ہوتی رہتی ہے، کیونکہ وحی کی قسمیں ہیں یعنی وہ وحی جو اولیاء کے لئے ہوا کرتی ہے ہر حقیقی مومن کو ہوسکتی ہے۔ اولیاء کے کچھ اور معنی نہیں ہیں دوستِ خدا کو کہا جاتا ہے تو مومن دوستِ خدا ہوسکتا ہے، خدا کا عزیز خدا کا پیارا ہوسکتا ہے۔ خدا کی دوستی کے سلسلے میں اگر آپ کوئی فلسفہ چاہتے ہیں تو میں اِس کی نشاندہی کرتا ہوں کہ قرآن کے اندر لَا یُحِبُّ اللہ جن جن الفاظ کے ساتھ آگیا ہے تو اُن الفاظ میں جو کچھ کہا گیا ہے اُس کے نزدیک نہیں جانا یعنی خدا دوست نہیں رکھتا ہے، مثلاً وَاللہُ لَا یُحِبُّ الظّٰلِمِیْن اور اللہ ظالموں کو دوست نہیں رکھتا ہے (۳:۵۷)۔ تو اِس کا اشارہ یہ ہے کہ جو بھی دنیا میں ظلم کرے گا اُس سے خدا دوستی نہیں کرے گا۔ فرمایا گیا ہے کہ وَاللہُ لَا یُحِبُّ الْفَسَاد خدا فساد کرنے والوں سے دوستی نہیں کرتا ہے (۲:۲۰۵)۔ اِس کے یہ معنی ہیں کہ خدا فساد کرنے والوں سے دوستی نہیں رکھتا ہے اور فساد کرنے سے ممانیت کرتا ہے۔ اِس کے برعکس بہت سی باتیں ایسی ہیں جن میں فرمایا گیا ہے کہ خدا ایسے شخص سے دوستی رکھتا ہے، اس کا تقاضا یہ ہے کہ اُس شخص کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے یا جو کچھ وہ شخص کرتا ہے جس کا ذکر قرآن میں ہے تو ہم نے بھی وہی کرنا ہے تاکہ خدا کی دوستی حاصل ہو۔ مقصد یہ ہے کہ خدا کن چیزوں کو پسند کرتا ہے اور کن چیزوں کو ناپسند کرتا ہے اِس فلسفے کے سمجھنے سے خدا کی دوستی حاصل ہوسکتی ہے اور مومنین کے لئے اِس بات کا سمجھنا بڑا آسان ہے، کوئی مشکل نہیں ہے کہ خدا کی دوستی کس طرح حاصل ہوسکتی ہے۔ خدا کی دوستی حاصل ہوسکتی ہے اور جب خدا کی دوستی حاصل ہوئی تو خدا کی قربت و نزدیکی حاصل ہوجاتی ہے، یعنی ایسے مومنین خدا کے نزدیک ہوجاتے ہیں۔

نزدیکی کے کیا معنی ہیں اور نزدیکی کا فلسفہ کیا ہے؟ وہ یہ کہ جو شخص خدا کے نزدیک ہو تو وہ ضرور توفیق کے عنوان سے یا اِلہام کے عنوان سے یا وحی کے عنوان سے خدا کی ہدایات کو حاصل کرتا رہے گا اور خدا کی ہدایات میں علم ہی علم ہے۔ اِس کے علاوہ قرآن کے اندر ایک آیت ہے، اُس کا مفہوم یہ ہے جو فرمایا گیا ہے، خدا فرماتا ہے کچھ لوگوں کا تذکرہ کرتے ہوئے کہ خدا ایسے لوگوں سے قیامت کے دن کلام نہیں کرے گا [لَا یُکَلِّمُھُمُ اللہُ یَوْمَ الْقِیٰمَۃ (۲:۱۷۴)]۔ اِس کی

منطق یہ بنتی ہے کہ خدا قیامت کے دن کچھ لوگوں سے کلام کرے گا اور کچھ لوگوں سے کلام نہیں کرے گا۔

ہم وحی کے لفظ کو چھوڑتے ہیں اہلِ ظاہر کے لئے، اگر اُن کو اعتراض ہے وحی کے لفظ کے استعمال کرنے سے تو ہم اُن کی خاطر اِس لفظ کو چھوڑتے ہیں اور دُوسرے لفظ کو لیتے ہیں اور اِسی لفظ کو لیتے ہیں کہ خداوندِ عالم نے فرمایا ہے کہ قیامت کے دَور میں، ہمارے نزدیک قیامت اسی دنیا میں برپا ہونے والی ہے، قیامت کے دور میں خداوندِ عالم کچھ لوگوں سے کلام نہیں کرے گا اور کچھ لوگوں سے کلام کرے گا اور جن لوگوں سے وہ کلام کرے گا اُن کو وہ اِس کلام کے ذریعہ سے پاک کرے گا [لَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا يُزَكِّيهِمْ (۲:۱۷۴) ترجمہ: ایسے لوگوں سے اللہ قیامت کے دن نہ کلام کرے گا اور نہ اُن کو پاک کرے گا]۔ کتنی اچھی منطق ہے، کتنی خوشخبری ہے، کتنا زبردست علم ہے، کتنی عظیم حکمت ہے اِس آیت کے اندر جن لوگوں سے اللہ تعالیٰ خطاب فرمائے گا، قیامت کے دور میں وہ حق تعالیٰ اِس خطاب کے ذریعہ سے اُن کو پاک کردے گا، پاکیزہ بنائے گا۔ یعنی اِس گفتگو کے نتیجے میں، اِس خدائی مخاطبت اور مکالمت کے وسیلے سے اُن کے سب گناہ معاف ہوجائیں گے۔

آپ گُمان کرتے ہیں کہ خدا کے کلام میں علم نہیں ہے؟ وہ تو علم کا سرچشمہ ہے، وہ تو ہدایت ہی ہدایت ہے، وہ نور ہے، اِس سے معلوم ہوا کہ علم سے گناہ معاف ہوجاتے ہیں، اِس سے معلوم ہوا کہ خدا مومنین سے کلام کرسکتا ہے۔ ایسا نہیں کہ اُس کا کلام کرنا صرف انبیاء علیہم السّلام ہی کے لئے مخصوص اور محدود ہو۔ جبکہ خداوندِ عالم نے یہاں پر ارشاد فرمایا کہ وہ قیامت کے دَور میں مومنین سے گفتگو کرے گا، کلام کرے گا، جب وہ کلام کرے گا تو اُس کے کلام میں اعلیٰ درجے کا علم ہوگا، اعلیٰ درجے کی نورانیت ہوگی، رُوحانیت ہوگی اور اُس میں علم وحکمت ہوگی، جس کے وسیلے سے یہ سننے والے مومنین پاک اور پاکیزہ ہوجائیں گے۔

اِس کے برعکس کچھ لوگ اِس کلام سے محروم رہ جائیں گے۔ پھر اِن کے گناہ اُن کے برعکس معاف نہیں ہوں گے اور اگر مان لیا جائے کہ قیامت انفرادی بھی ہے، اجتماعی بھی ہے اور انفرادی قیامت کے یہ معنی ہیں کہ کسی بندۂ مومن کی کوشش سے کبھی بھی ذاتی طور پر برپا ہوسکتی ہے، نتیجہ اِسکا یہ ہوا کہ انفرادی قیامت میں بھی خداوندِ عالم کسی مومن سے کلام کرے گا تو جب کلام کرے گا تو وہ کلام اِیسا کلام ہوگا جیسے موسیٰؑ کلیم اللہ سے کیا گیا تھا یا آنحضرتؐ سے معراج کے مقام پر کیا گیا تھا وہ کلام وحی کے برابر ہوگا، نام اُس کا وحی نہیں ہوگا لیکن درجہ کے لحاظ سے وہ وحی کے برابر ہوگا۔

تو یہ ہوا علم کے سرچشمے سے علم کو حاصل کرنا اور مثال کے طور پر بستی سے گزر کر ندی کے پاس جانا یا پہاڑ پر پہنچنا اور وہاں سے جو چشمہ جاری تھا اُسی چشمہ کو دیکھنا کہ کسطرح پانی اُبلتا ہے اور کتنا صاف ہے، کس قدر شیرین ہے اور آگے سے آگے آکر کتنا آلودہ ہوجاتا ہے۔ اِسی طرح کوئی مومن علم کے پانی کے اُس سرچشمے تک پہنچ سکتا ہے یہ بنیادی علم ہے اِس کو کہتے

ہیں بنیادی علم۔اب ایسے شخص کے لئے کوئی خوف نہیں ہے کہ علم میں کیسی کیسی الجھنیں پیدا ہوگئیں اور کیسے کیسے مسائل ہیں ۔مسائل ہیں لوگوں کے لئے ہیں ہمارے لئے نہیں ہیں،نہر کا پانی اگر گندہ ہے تو ہے،لیکن ہم علم کے سرچشمے کے قریب جاسکتے ہیں اور ندی تک پہنچ سکتے ہیں اور ہم وہیں سے صاف وشفاف پانی کو استعمال کرسکتے ہیں ۔ہم نے دیکھا ہے کہ کسطرح پانی گندہ ہو جاتا ہے چونکہ ہم نہر کے کنارے کنارے جارہے تھے تو ہم کو پتہ چلا کہ رستے میں کسطرح مٹی پڑتی ہے،لوگ کسطرح کُوڑا کرکٹ اِس میں پھینکتے ہیں اور لوگوں نے موریاں [نالیاں] غلطی سے یا جان بوجھ کر کسطرح نہر کی طرف چھوڑ دیں ہیں ۔جب اُنہوں نے پانی کو استعمال کیا تو پھر پانی گندا ہوگیا،لوگ جب اپنی غرض کے لئے پانی کو استعمال کرتے ہیں تو پانی میں جراثیم آتے ہیں ۔تو علم بھی پانی کی طرح ہے،اِس لئے ہم دوسرے لوگوں کی روایات کو اپناتے نہیں ہیں،اُنکو سنتے نہیں ہیں ہمارے نزدیک وہ چیزیں ناصاف ہیں، ہم کو خداوند نے بہت پاک و پاکیزہ چیزیں عنایت کی ہیں ہم ہمیشہ اِن پاکیزہ چیزوں سے فائدہ اُٹھاتے ہیں اور انہی کو استعمال کرتے ہیں ۔

تو میں کہہ رہا تھا وحی کے موضوع سے بحث کرتے ہوئے کہ بہت سی اصطلاحیں ہیں جو کہ وحی کے برابر معنی رکھتی ہیں اُن میں وحی جیسے معنی ہیں،بہت سی اصطلاحیں ہیں اُن کا مطلب ایسا ہے جیسے وحی کا مطلب ہے،اُن کا مفہوم ایسا ہے جیسا وحی کا مفہوم ہے ۔تو اس لئے ہمارے نظریات دُوسروں سے الگ اور مختلف ہیں،ہماری تعلیمات مخصوص ہیں،ہم کو دُوسروں کی کتابوں سے کوئی فائدہ نہیں ملتا،ہماری اپنی مخصوص کتابیں ہیں اور اُن میں اعلیٰ اعلیٰ باتیں ہیں ۔ہم اسماعیلی فرشتے ہیں، فرشتوں کی غذائیں مخصوص ہوا کرتی ہیں،فرشتوں کی غذائیں جلالی غذائیں ہیں،اور پاک و پاکیزہ غذائیں ہیں ۔اِس لئے ہمیں پُر اُمید زندگی بسر کرنی ہے ہمیں کوئی مایوسی نہیں ہونی چاہئے،ہمیں کوشش جاری رکھنی چاہئے،تو یہ علم ہم کو ذرّہ ذرّہ ملے گا یعنی شروع شروع میں کم ملے گا اور جب آگے سے آگے بڑھیں گے تو اِس علم میں اضافہ ہو جائے گا اور بہت زیادہ اضافہ ہو جائے گا۔

وحی کی ایک مثال بارش کا پانی اور توفیق کی مثال شبنم:

چلئے ایک اور مثال پیش کرتے ہیں پانی ہی سے اگر وحی جیسے مقام کا علم بارش کی طرح ہے تو توفیق شبنم کی طرح ہے ۔بارش کا برسنا سب دیکھتے ہیں لیکن شبنم کا پڑنا کوئی نہیں دیکھتا ہے،لیکن اگر رات کو خوب شبنم پڑتی ہے تو باغ وچمن اُس سے کافی حد تک سیراب ہو جاتا ہے ۔شبنم سے میری کیا مُراد ہے اور بارش سے کیا مطلب ہے؟ بارش وہ علم جو کہ نمایاں کلام سے کسی مومن کو حاصل ہوتا ہے،اِس میں مولا کلام کرتا ہے،اِس میں خداوند خطاب فرماتا ہے اور شبنم کا مطلب ہے کہ رُوحانیت کی کسی آواز کے بغیر آپ کے ذہن وضمیر میں لاشعوری طور پر اچھی اچھی باتیں اُبھرتی ہیں،ذہن کی سطح پر اچھی

اچھی حکمتیں، اچھے افکار، اچھے خیالات اور علم کی جدید قسم کی، نرالی قسم کی، انوکھی قسم کی باتیں اُبھرتی ہیں۔

اِس کا پس منظر کچھ بھی ہو عبادت ہو، ذکر ہو یا کہ دینی کتابوں کا مطالعہ ہو کوئی پس منظر تو ہونا چاہیے یا اخلاق کی بلندی ہو تو اُس وقت آپ کے اندر علم کی شبنم پڑتی ہے تو میں نے ایسے علم کی تشبیہہ شبنم سے دی اور اُس طوفان خیز علم کی تشبیہہ بارش سے دی جسکا نام وحی ہے۔ اہلِ ظاہر کے نزدیک اور اہلِ باطن کے نزدیک اُس کا نام علمِ لدّنی ہے، علمِ لدّنی کا مقصد وہ علم جو براہِ راست خدا کے حضور سے ملا کرتا ہے۔ آج میں نے اس موضوع پر اِس لئے بات کی کہ ممکن ہے کہ بعض سادہ مومنین مایوس ہو جاتے ہوں کہ اُن کو علمِ روحانی تک رستہ نہیں ملا۔

<u>خداوند تعالیٰ کا قانونِ ہدایت:</u>

خداوند تعالیٰ ذاتی طور پر نہ کسی کو گمراہ کر دیتا ہے اور نہ کسی کی راہ نمائی کرتا ہے۔ اِس بات سے فوری طور پر آپ کو تعجب ہوگا جو میں نے بات کی اور کہا کہ خدا ذاتی طور پر نہ کسی کو گمراہ کر دیتا ہے اور نہ کسی کی ہدایت کرتا ہے۔ ہاں یہ بات ہے اور حقیقت ہے اِس کا ثبوت یہ ہے کہ خدا تو بادشاہ ہے اُس نے ہدایت کے لئے تو دنیا میں ہادیٔ برحق کو بھیجا ہے اور گمراہ کر دینے کے لئے اُس نے شیطان کو رکھا ہے، یہ دو وسیلے ہیں، ایک نیکی کا اور دوسرا بدی کا۔ خدا ذاتی طور پر ایسا کوئی کام نہیں کرتا کیونکہ وہ بادشاہ ہے، کہ اگر خدا نیکی کی حمایت کرے یعنی راہِ راست کی صرف ہدایت کرے تو وہ حریف بن جائے گا، مدِّ مقابل بن جائے گا شیطان کا، اور خدا کی شان اِس سے گھٹ جائے گی کہ وہ ایک ادنیٰ مخلوق کا مدِّ مقابل بن رہا ہے اور وہ شیطان ہے اور ظاہر ہے کہ وہ بھلائی کو چھوڑ کر یکطرفہ بُرائی کی حمایت بھی نہیں کرتا ہے۔

اِس لئے ماننا پڑے گا کہ اللہ تعالیٰ اِن دو چیزوں سے بالا و برتر ہے کہ وہ نہ نور ہے نہ ظلمت ہے، یعنی وہ تاریکی بھی نہیں اور روشنی بھی نہیں۔ جیسا کہ میں نے کہا کہ خدا کو روشنی بن کر تاریکی کا مقابلہ نہیں کرنا چاہئے اور اگر تصور کریں کہ خدا بذاتِ خود روشنی ہے تو وہ ہمیشہ سے روشنی ہوگا پھر یہ ظلمت کیسے پیدا ہوگئی خدا کے ہوتے ہوئے اور خدا کے اَب تک مقابلہ کرتے کرتے تاریکی کیوں ختم نہیں ہوئی؟ یہ بات نہیں ہے۔ اِن مثالوں سے، اِن باتوں سے یقین آیا کہ خدا ذاتی طور پر نہ تو ہدایت کرتا ہے اور نہ کسی کو گمراہ کرتا ہے۔

دنیا کے اندر دو Sources ہیں، ایک نیکی کا جو امامؑ ہے ایک بدی کا جو شیطان ہے، تو شیطان بھی ایک شخص ہے۔ دنیا کے اندر جتنے بڑے ہوشیار دانا اور خدا سے انکار کرنے والے لوگوں کو راہِ خدا سے بھٹکانے والے جتنے لوگ ہیں اُن سب کو ملا کر آپ ایک شیطان قرار دیں اور امامؑ کو اور اُس کے حدودِ دین کو اور مومنوں کو ملا کر آپ نور قرار دیں چونکہ مومنین بھی امامؑ ہی کے اجزاء ہیں۔ اُس کے حدود جو ہیں وہ اس کے Parts ہیں۔ ایک لحاظ سے دُنیا کے اندر دو

Mission ہیں خیر کا اور شر کا، یعنی نیکی کا اور بدی کا، تو نیکی کی طرف خدا کا خلیفہ، پیغمبر کا نمائندہ امامؑ اور بدی کی طرف اُسکی ضدّ، اُس کا دشمن اُس کا مدِّ مقابل اور اُس کا حریف جو لوگوں کو گمراہ کر دیتا ہے وہ شیطان ہے۔

آپ کو ثبوت ملا شیطان کا بھی اور ہادیٔ برحق کا بھی، ابھی آپ سوچیں کیا یہ انصاف ہوگا کہ شیطان انسان کے دل میں وسوسہ ڈال سکتا ہے، ورغلا سکتا ہے، بھٹکا سکتا ہے اور کوئی آواز پہنچا سکتا ہے لیکن ہادیٔ برحق کی کوئی آواز سنائی نہیں دیتی ہے۔ گمراہی کی آواز سنائی دے سکتی ہے لیکن ہدایت والی آواز پہنچ نہیں سکتی ہے، کیا یہ بات صحیح ہو سکتی ہے؟ یا عقل کا انصاف اور فیصلہ یہی ہے کہ دونوں چیزیں برابر برابر ہیں، اگر شیطان آواز دے سکتا ہے تو ہادیٔ برحق بھی اپنی آواز مومنین تک کسی نہ کسی طرح پہنچا سکتا ہے۔ اَب ہم خیر کی آواز سننا چاہتے ہیں یا شر کی یہ ہم پر دارومدار رکھتا ہے یہ ہماری کوشش پر انحصار کرتا ہے کہ ہم شر سے بچ کر خیر کی طرف زیادہ سے زیادہ توجہ دے سکتے ہیں اور خیر کو چھوڑ کر شر کی طرف بھی جھک سکتے ہیں نیز کبھی اُس کو اور کبھی اِس کو بھی سُن سکتے ہیں یہ سب باتیں ممکن ہیں، اِسی کا نام اختیار ہے۔ ہم کو Choice دی گئی ہے، اختیار دیا گیا ہے اور خداوندِ عالم نے کوئی کمی کوتاہی نہیں کی ہے، اسباب میں، ذرائع میں، وسائل میں، اُس نے ہر چیز مہیا کر دی ہے۔ پھر چاہنے والوں کو خیر کے وسائل مہیا کر دئے ہیں اور شر کے پیچھے چلنے والوں کو شر کے ذرائع مہیا کئے گئے ہیں۔ اِس گفتگو سے میرا مقصد یہ تھا کہ میں آپ کو واضح کروں کہ خدا کے کلام سے مُراد امامؑ کا کلام ہے۔

ابھی آپ کو ثبوت فراہم کیا گیا کہ خدا بذاتِ خود نہ ہدایت کرتا ہے اور نہ کسی کو گمراہ کرتا ہے اِس معنی میں امامؑ خدا کا نمائندہ ہے تو امامؑ کی آواز خدا کی آواز ہوگی، امامؑ کا کلام خدا کا کلام ہوگا، امامؑ کی ہدایت خدا کی ہدایت کہلائے گی اور جو خدا نے فرمایا تھا کہ قیامت کے دَور میں مَیں جن لوگوں سے کلام کروں گا وہ پاک ہو جائیں گے اور جن لوگوں سے میں کلام نہیں کروں گا وہ پاک نہیں ہو سکیں گے تو یہ کلام بھی امامؑ ہی کرے گا، خدا کا فعل، خدا کا قول امامؑ کے وسیلے سے ظاہر ہوتا ہے۔ جس طرح پیغمبر کو خدا نے اپنا ہاتھ قرار دیا، جس طرح قرآن میں ہے کہ خدا نے داؤدؑ کی زبان سے کچھ لوگوں پر لعنت بھیجی [لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا مِنْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰي لِسَانِ دَاوٗدَ (۵:۷۸)۔ ترجمہ: بنی اسرائیل میں سے جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی اُن پر داؤد کی زبان سے لعنت کی گئی ہے]، اِس سے معلوم ہُوا کہ پیغمبروں اور اماموں کے توسط سے خدا بولتا ہے اور کام کرتا ہے۔

خدا کی مدد کب آتی ہے؟:

اِس تمام گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ علم بہت ہی قریب ہے، حقیقی علم، رُوحانی علم، وہ علم جسے لدنّی کہا جاتا ہے۔ خدا کی قسم! ہمارے بزرگانِ دین میں سے اکثر وہ تھے جنہوں نے رُوحانی طور پر علم حاصل کیا تھا، یہ علم زیادہ سے زیادہ اُس وقت

حاصل ہوتا ہے جبکہ مومن کسی Mission پر روانہ ہو جاتا ہے۔ ذاتِ پاک کی قسم! جب بندۂ مومن کسی دینی کام پر معمور ہو جاتا ہے اور دشمن اُس کو ستانے لگتے ہیں تو اُس وقت خدا کی رحمت جوش میں آتی ہے اور خدا کی مدد آگے بڑھتی ہے اور اُس مومن کے استقبال کو آتی ہے۔ جیسا کہ میں نے اپنی مناجات میں ابھی ابھی مثال دی تھی کہ جب چھوٹا سا بچہ چلنے کی نیّت سے کھڑا ہو جاتا ہے اور ایک آدھا قدم کے بعد وہ گرتا ہے تو اُس وقت بڑی تیزی کے ساتھ اُس کا باپ آگے بڑھ کر اُس کو سنبھالتا ہے، اُس کو پکڑتا ہے۔ اِسی طرح خدا کی قسم! زیادہ سے زیادہ رُوحانی مدد اُس وقت آتی ہے جبکہ مومن کسی مصیبت میں مبتلا ہو جاتا ہے، لیکن وہ مصیبت ایسی ہو کہ ظلم کی صورت میں ہو اور وہ دین کی خدمت میں ہو اور دشمن نے اُس پر ظلم کے پہاڑ ڈھائے ہوں تو اُس وقت خدا کی مدد اُس کی دستگیری کے لئے آتی ہے۔ جو مومنین راہِ خدا میں قید و بند میں جاتے ہیں اور اُن کو ستایا جاتا ہے، اُن پر ظلم کیا جاتا ہے تو اُن کا جوہر کھلتا ہے اور طرح طرح کے معجزات اُن پر گزرتے ہیں۔ کوئی دوست کسی دوست کی مدد نہیں کرتا ہے جب تک کہ وہ اپنی ہمت بھر کام نہ کرے اور پھر وہ مدد کے لئے محتاج ہو جائے، آدمی جب سو جاتا ہے اور ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ جاتا ہے تو دوست اُس کی مدد نہیں کرتا ہے۔ دوست اُس کی مدد اُس وقت کرتا ہے اور اس وقت مدد کرنی چاہئے جبکہ وہ کام کے لئے اُٹھے اور اپنا سارا زور اُس میں لگائے پھر بھی وہ کام اُس سے نہیں ہو پاتا تو تب اُس کے دوست میں ہمدردی کے جذبات اُبھرتے ہیں اور کہتا ہے کہ میرا دوست کام کرتا ہے اور اُس کے اندر بس اتنی طاقت تھی۔ اُس نے پوری طاقت کو استعمال کیا یہ کام نہیں بنتا، اب میرا فرض ہے کہ میں اُس کی مدد کروں تو اُس وقت خدائی مدد آتی ہے۔ چنانچہ آپ بھرپور ریاضت کریں اور ایسی دینی خدمت کریں اور کوئی بھی نیک کام ہو آپ کریں اور ہمت سے کریں اور پوری طاقت کو استعمال کریں۔ مثلاً ذکر میں ذکر کی مثال کو لیں سب سے پہلے آپ ذکر اِس انداز سے کریں، اِس شان سے کریں کہ آپ نے اپنی تمام Energy اِس میں صرف کی اور آپ تھک رہے ہیں اور آپ ہار رہے ہیں لیکن ذکر آگے نہیں بڑھتا تو اُس وقت خدا کی مدد آئے گی۔ آپ ڈھیلے پنے سے ذکر کرتے ہیں، جہاد جیسی کیفیت میں ذکر نہیں کرتے ہیں اور بڑی سُستی سے ذکر کرتے ہیں، آپ میں سُستی آرہی ہے، آپ سُستی کی وجہ سے جمائیاں لے رہے ہیں، نیند سے سرلٹک رہا ہے اور جہاد کی کوئی مثال آپ میں نہیں ہے تو اُس وقت خدا کی مدد نہیں آنے کی، نہیں آئے گی۔ خدا کی مدد اس وقت آئے گی جب آپ بھرپور جہاد کی طرح ذکر کو چلائیں، ذکر کو چلائیں، ذکر کو چلائیں آپ اِس حد تک کوشش کریں کہ آپ کے اندر جو طاقت تھی سب آپ نے صرف کی اور اب کوئی چیز نہیں ہے، ابھی آپ شکست کھانے والے ہیں تو اُس وقت یکدم سے خدا کی مدد آئے گی اور دستگیری کرے گی۔

جنگوں میں بھی ایسا ہوا ہے، آپ قرآنی آیتوں کو پڑھیں کہ خدا کی مدد مومنین کو کب آتی ہے؟ تقویٰ اختیار کرنے سے، عبادت کرنے سے اور اپنے سے زیادہ تعداد کے لشکر سے مقابلہ کر کے بھرپور جہاد کرنے سے اِس کے نتیجے میں خدائی

مدد آتی تھی ۔آپ اُن آیات کو پڑھیں،قرآن کا مطالعہ کریں اُس میں حکمت ہے،اُس میں دانائی ہے،اُس میں روشنی ہے، اسماعیلیت ہے،رُوحانیت ہے،حکمت کی باتیں ہیں ۔قرآن آپ کی حمایت کرتا ہے،وہ امامؑ کی حمایت کرتا ہے،وہ حق اور حقیقت کا حامی ہے،قرآن جو اللہ کی کتاب ہے،جو حکمت کی کتاب ہے،اُس میں رُوحانیت بھری ہوئی ہے تو آپ قرآن پڑھیں اور قرآن کی آیتوں سے استفادہ کریں آپ کو خوشی ملے گی۔

بہر حال آج کی مجلس میں ، میں نے چند منتشر جملوں میں یہ کوشش کی کہ میں آپ کو سمجھاؤں کہ رُوحانی علم کیا ہے؟ وحی جیسی کیفیت کیا ہے اور کتنے الفاظ ہیں،کیسے کیسے الفاظ ہیں اِس مطلب کے لئے جو استعمال ہوتے ہیں ۔آپ کچھ تصوف کی کتابیں پڑھیں،حالانکہ تصوف ہم سے پچھلا علم ہے ہم اُس سے آگے ہیں،وہ طریقت ہے،اسماعیلیت حقیقت ہے ۔تاہم مثال لینے کے لئے آپ تصوف کی کتابیں پڑھ سکتے ہیں،بہر حال آپ تصوف کی کتابیں نہ پڑھیں تو مجلس میں توجہ دیں اور خالص رُوحانیت کی باتیں سُنیں،ایسی باتیں جو خاص ہیں،جو معلوماتی ہیں،اُن کے اندر حقیقت کا مغز،تاویل کا مغز بھرا ہوا ہے،یہ باتیں بالکل Direct ہیں اور چوٹی کی باتیں ہیں۔

آپ پوری دنیا کا گشت لگائیں تو ایسی باتیں نہیں ملیں گئیں،کہاں سے ملیں گی؟ سوائے یہ کہ آپ کا جو رُوحانی استاد ہے وہ آپ کو بتائے گا،وہ آپ کا خیر خواہ ہے،وہ آپ کا خادم ہے،وہ آپ کا رُوحانی ملازم ہے،وہ آپ کا غلام ہے،وہ آپ کو بہت چاہتا ہے،وہ چاہتا ہے کہ آپ آگے بڑھیں،وہ چاہتا ہے کہ آپ کوئی خدمت کریں۔

آپ کتابیں پڑھیں،کتابوں میں یہی باتیں ہیں،جو باتیں مجالس میں ہیں،وہی باتیں کتابوں میں ہیں ۔لیکن کتابوں میں ایک بات ہے اُس میں احتیاط سے الفاظ کو استعمال کیا گیا ہے ۔ایسا نہ ہو کہ لوگ کہیں کہ اِس آدمی نے بہت فخر کیا ہے،ایسا نہ ہو کہ لوگ کہیں کہ اِس آدمی نے تو نبوت کا دعویٰ کیا ہے،ایسا نہ ہو کہ لوگ کہنے لگیں کہ یہ کہتا ہے کہ مجھ کو رُوحانی علم ملتا ہے ۔تو اِس بات سے بچنے کے لئے الفاظ کو بہت ہی احتیاط سے استعمال کیا گیا ہے،بہر حال ایسا بھی نہیں ہے کہ ہم نے لوگوں سے خوف کھایا ہے،ہم نے بار بار حق بات کہی ہے خصوصاً کتابوں کے دیباچوں میں آپ دیکھیں،اُس میں مَیں نے اشارہ کیا ہے کہ علم کس معیار کا ہے؟ کہاں کا ہے؟ یہ ہم پر فرض عائد ہو جاتا تھا کہ ہم اپنے عزیزوں کے فائدے کے لئے راستہ بتائیں اور کہیں کہ یہ کس معیار کا علم ہے ۔اِس لئے میں نے ایک طرح سے یہ کہا ہے کہ یہ علم مولا کا دیا ہُوا ہے اور ہم آگے سے آگے اِس چیز کو زیادہ سے زیادہ آشکار کریں گے۔

جیسے جیسے لوگ سمجھنے لگیں گے اور جیسے جیسے کتابیں پھیل جائیں گی ویسی ویسی ہم بڑی بڑی اونچی اونچی باتیں حقیقت پر،صداقت پر مبنی ہم کرتے جائیں گے،ہم چاہتے ہیں کہ کوئی انقلاب آئے،علمی انقلاب ۔ اِس کام میں ہم سب مل کر لشکر ہیں،امامؑ کے لشکر ہیں یہ امامؑ کا کوئی منشاء ہے اِس میں،امامؑ کا کوئی پروگرام ہے،خوشی کی بات ہے کہ امامؑ نے اِس

رُوحانی پروگرام میں ہم کو آپ کو موقع دیا ہے۔امامؑ کا ضرور اِس میں کوئی پروگرام ہے اِس میں کوئی راز ہے۔بہت بڑا پروگرام ہے،اِس دور میں اِس زمانے میں امامؑ کوئی علم کی لہر دوڑانا چاہتے ہیں،علم کی کوئی لہر دوڑانا چاہتے ہیں۔

تو اِس گفتگو کا مقصد یہ ہے کہ آپ بالکل امامؑ کے رُوحانی علم سے قریب ہیں، آپ منتظر رہیں، آپ کوشش کریں،آپ پر اِس وقت بھی علم کے لمحات گزرتے ہیں۔علم کے لمحات سے کیا مطلب ہے؟ دیکھیں آپ کو تجربہ ہُوا ہوگا کہ رُوحانی باتیں کس طرح Pass ہوتی ہیں۔رُوحانیت کی کوئی بات چھوٹی سے چھوٹی بات جب ذہن کی سطح سے ٹکراجاتی ہے تو اتنا بڑا خاکہ بن جاتا ہے علم کا، وہ علم کا ایک بہت بڑا Program بن جاتا ہے، وہ علم کی ایک بہت بڑی کتاب کا خاکہ بن جاتا ہے۔اِس لئے آپ کو یقین ہونا چاہئے کہ اسماعیلیوں کے لئے رُوحانی علم بہت ہی قریب ہے، بہت ہی قریب ہے اور خصوصاً اُن کے لئے جن کی کچھ پرورش ہو رہی ہے رُوحانی علم کے لئے۔

آپ پُرامید ہو جائیں، آپ خود کو مبارک کہیں، خود کو مبارکبادی دے دیں، آپ شادمان رہیں کہ آپ جو علم سے حاصل کریں گے دُوسرے لوگ بہت کم اِس کو حاصل کرسکیں گے۔تو میرے خیال میں، اتنی سی باتیں فی الوقت کافی ہیں اور آپ اگر اس سلسلے میں کوئی بات پوچھنا چاہیں تو پوچھ سکتے ہیں۔

نوٹ: ناچیز نے استاد بحرالعلوم صاحب کی مدد اور رہنمائی سے اِن خزائن علمی سے استفادہ حاصل کرنے کی غرض سے اِسے تحریر میں لانے کی حقیر کوشش کی ہے۔

ناچیز نسرین اکبر

استادِ بزرگوار علّامہ نصیر الدّین نصیرؔ ہونزائی (قس)
کا پُرحکمت بیان
عنوان: دین قانونِ فطرت ہے

Click here for Audio

کیسٹ نمبر: ۳ تاریخ: ۱۹۷۷ء

مقام: کراچی دورانیہ: ۶۰ منٹ

دین کا ظُہور نورِ محمّدی رقلمِ الٰہی میں:

اسلام جو دینِ فطرت ہے، یعنی ایسا دین جو قانونِ قدرت کے موافق ہے، بلکہ یہی دین خود قانونِ فطرت ہے۔ سب سے پہلے یہ دین اللہ تعالیٰ کی صفات میں تھا یعنی اِس مقدّس مذہب کی حقیقتیں اللہ تعالیٰ کی صفات کی حیثیت سے تھیں۔ پھر اُس کے بعد اِس دین کا ظُہور حضرت محمّد مصطفیٰ صلّی اللہ علیہ والہٖ وسلّم کے نور کی حیثیت میں ہوا یعنی یہ دین جو اللہ تعالیٰ کی صفات میں تھا، ازل میں نورِ محمّدی کی حیثیت سے اِس کا ظُہور رہوا، اُس نورِ محمّدی میں اِس پاک دین کی اعلیٰ سے اعلیٰ حقیقتیں موجود تھیں۔ نورِ محمّدی کا دوسرا نام قلمِ الٰہی تھا اور وہی قلمِ الٰہی عرشِ اعظم کہلاتا تھا اور اُس کا ایک اور نام عقلِ کُلی تھا۔ چنانچہ یہ دین سب سے پہلے نورِ محمّدی میں، قلمِ الٰہی میں، عقلِ کُلی میں اور عرشِ اعظم کی حیثیت میں تھا۔

یہاں یہ سوچنا ضروری ہے کہ ہر چیز کا کوئی وجود ہوتا ہے، اُس کی کوئی حیثیت ہوتی ہے یا یہ کہ ہر چیز کی کوئی شکل و صورت ہوا کرتی ہے، تو سوال ہے کہ اگر نورِ محمّدی کا ظُہور ازل میں ہوا تو اُس نور کی کیفیت وصورت کیا تھی؟ یعنی وہ کس چیز کا نور تھا؟ ظاہر ہے کہ وہ کوئی مادّی نور تو نہیں تھا، بلکہ عقلی نور تھا اور علمی نور تھا۔ جب مانا گیا کہ وہ عقلی نور تھا اور علمی نور تھا تو اُس کی کوئی شکل وصورت اور کوئی حیثیت ہونی چاہیے اور وہ یہ کہ زمانہ آدمؑ سے لے کر قیامت تک اِس دینِ حق کی جو جو حقیقتیں ظاہر ہوتی رہی ہیں وہ سب ازل میں نورِ محمّدی کی ہستی میں یکجا تھیں۔

آپ نہ بھولیے گا کہ ہم نے نورِ محمّدی کا دوسرا نام عرشِ الٰہی یا کہ عرشِ اعظم بتایا ہے، ایک اور نام قلمِ الٰہی ہے اور چوتھا نام عقلِ کُلی ہے، بہرحال نام جو بھی ہو وہ نور تھا اور نور کی ہستی عقلی اور علمی تھی۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ ہر چیز کی کوئی ہستی ہوتی ہے، بعض چیزیں مادّی ہیں یعنی جسمانی، کچھ چیزیں روحانی ہیں اور کچھ عقلی، تو عقلی اور علمی کا مطلب ایک ہے۔ چنانچہ سب سے پہلے عقلی وُجود ہونا چاہیئے یعنی علمی وجود پھر اُس کے بعد روحانی اور آخر میں جسمانی وُجود ہے۔ لہٰذا ماننا پڑے گا کہ سب

سے پہلے جو قلمِ الٰہی تھا یا کہ نورِ محمّدی وہ عقلی صورت میں تھا اور اُس کے اندر دین کی حقیقتیں موجود تھیں۔ اِس تذکرے میں یہ بتانا اور یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ دینِ حق یعنی ہمارا دین وہ آج سے نہیں ہے وہ ازل سے ہے اور جب مانا گیا کہ یہ دین ازل سے ہے تو ثابت کرنا ہوگا کہ وہ کس صورت میں تھا اور اُس کا کیا نام تھا، اب آیئے دیکھتے ہیں کہ اُس کے بعد کیا ہوا۔

<u>دین کا ظُہور لوحِ محفوظ پر:</u>

یہ دین قلمِ الٰہی یا کہ نورِ محمّدی کے بعد لوحِ محفوظ پر آیا تو وہاں اُس کی شکل روحانی بن گئی یعنی وہاں جو بھی حقیقت تھی وہ روحانی حقیقت تھی۔ جس طرح شریعت کی زبان میں بتایا جاتا ہے کہ قلم سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے قلم لکھ وہ ساری چیزیں جو میرے ارادے میں ہیں تو اسی ایک امر کے ساتھ قلم نے تمام چیزیں لوحِ محفوظ پر لکھ ڈالیں تو اُس وقت دین کا دوسرا ظُہور رہوا لوحِ محفوظ پر۔ اب یہاں ذرا رُک کر ہم یہ بتائیں گے کہ یہی دین قرآن تھا جو ازل میں اللہ تعالیٰ کی صفات میں تھا اور یہی دین، قرآن اور نورِ محمّدی کی حیثیت میں قلمِ الٰہی پر آیا یا کہ اِس کا دوسرا نام قلمِ الٰہی ہوا اور اُس کے بعد یہی دین یہی قرآن یہی نورِ محمّدی لوحِ محفوظ پر اُتر آیا۔

<u>دین کا ظُہور روح کی صورت میں:</u>

لوحِ محفوظ سے اِس دین کا ظُہور انبیاء علیہم السّلام کی آسمانی کتابوں کی صورت میں ہوا۔ اِس دین کا تیسرا ظُہور وحی کی صورت میں ہونے لگا، یہی اسلام، یہی دینِ حق، یہی ہمارا مذہب وحی کی صورت میں اب دنیا میں ظاہر ہونے لگا، انبیاء علیہم السّلام کی روحانیت میں ظاہر ہونے لگا، اِس کو آپ وحی کہہ سکتے ہیں، روحانیت کہہ سکتے ہیں۔ یعنی زمانۂ آدم سے آغاز کر کے اِس کا ظُہور رہونے لگا اور رفتہ رفتہ ہر بڑے پیغمبر پر اِس کا ایک ظُہور رہوا اور حضرت نبی محمّد صلّی اللہ علیہ والہٖ وسلّم پر اس کا کامل ظہور رہوا، یعنی دینِ حق کا، اسلام کا اور ہمارے مقدس مذہب کا ظُہور۔

حضرت مولانا سلطان محمّد شاہؑ کے فرامینِ اقدس میں یہی اشارے ہیں امامِ عالی مقام نے ارشاد فرمایا ہے کہ ''اسماعیلی مذہب ایک ایسا پھول ہے جو مختلف رنگوں میں ہے''۔ (کراچی، ۷/ ۲/ ۱۹۵۱) یعنی اسماعیلی مذہب قدیم دین ہے اور یہ ایک ایسا پھول ہے جو مختلف زمانوں میں مختلف رنگوں میں کھلتا ہے، اس ارشاد کا مفہوم یہ ہے اور اسی کی میں نے کچھ وضاحت کی، تو لوگ سمجھتے ہیں کے اسلام دین حضرت محمّد صلّی اللہ علیہ والہٖ وسلّم کے زمانے سے ہے حالانکہ وہ خود دیکھتے ہیں کہ قرآن کے اندر اس کا ذکر ہے کہ یہ ابراھیمؑ کے زمانے سے ہے۔ اور کچھ دوسری آیتوں میں ارشاد ہے کہ یہ نوحؑ کے زمانے سے ہے اور کچھ اِس سے بڑھ کر یہ کہ یہ دین، دینِ فطرت ہے اور خدائی دین ہے، لہٰذا خدا کی عادت و

سنّت کی حیثیت سے، قانونِ قدرت کی حیثیت سے یہ دین ہمیشہ سے پایا جاتا ہے۔

خدا کا دین، رسول کا دین اور مومنین کا دین:

یہاں پر ایک بات بتائیں گے جو اہم ہے وہ یہ کہ آپ جانتے ہیں کہ خدا کا بھی دین ہے، رسول کا بھی دین ہے اور مومنین کا بھی دین ہے، لیکن خدا کا الگ، رسول کا الگ اور مومنین کا الگ دین نہیں ہے، یہی دینِ حق خدا کا بھی ہے، پیغمبر کا بھی اور مومنین کا بھی۔ لیکن ایک سوال یہاں یہ پیدا ہوتا ہے کہ دین اسلام خدا کی کس حاجت کے لئے ہے؟ انسانوں کے لئے دین تو ضابطۂ حیات کی حیثیت سے ہے، خدا دین کو کیا کرتا ہے؟ ہمارے لئے دین اس لئے ہے کہ ہم اِس دین کے مطابق عمل کریں تو ہم کو کوئی اجر ملے گا۔ لیکن خدا اجر وصلہ سے بے نیاز ہے بلکہ وہ خود اجر وصلہ دینے والا ہے۔ اُس نے انبیاء کو دین دے کر دنیا میں بھیجا لیکن اُس کے لئے دین کی کیا حاجت ہے اور کس حیثیت سے خدا نے دین کو اپنایا ہے یہ کب سے ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اسلام یا کہ دینِ حق خدا کے لئے اُسکی عادت وسنّت اور قانون کی حیثیت سے ہے، ضابطۂ حیات کی حیثیت سے نہیں ہے۔

[خدا کا دین] اُس کے قانون اُسکی عادت اور سنّت کی حیثیت سے ہے۔ جب مانا گیا کہ اِس دنیا کے اندر ایک دین ہے، جس کو خدا کی سنّت وعادت حاصل ہے، یعنی وہ خدا کی سنّت وعادت کی حیثیت سے ہے۔ تو اِسکی منطق یہ بن گئی کہ یہ دین ہمیشہ سے ہے یعنی ازل سے ہے کیونکہ خدا کی عادت وسنّت کو تو ہمیشہ سے ہونا چاہئے۔ اور جب خدا کا دین ہمیشہ سے ہے تو اُس کی کوئی شکل وصورت چاہئے اُس کی کوئی ہستی چاہئے حیاتِ قضائی چاہئے تو اسی کے مطابق میں نے کہا کہ خدا کے دین کی شکل وصورت عقلی ہے، علمی ہے، پھر اُس کے بعد روحانی ہے، پھر اُس کے بعد تحریری ہے، پھر اُس کے بعد عملی ہے، اِس کی مختلف شکلیں ہیں۔

عملی، آپ جانتے ہیں کہ آج جو سچے مسلمان ہیں، یہ جو حقیقی مومنین ہیں اُن کے اندر اسلام کس معنی میں ہے؟ کس حیثیت میں ہے؟ عمل کی صورت میں ہے اور جب یہ اسلام نازل ہوا تو کس صورت میں تھا؟ روحانیت کی، ہدایت کی، نورانیت کی حیثیت میں، اور لوحِ محفوظ پر روح کی شکل میں، اور عقلِ کل میں عقلی حیثیت میں، علمی صورت میں، اور خدا میں سنّت وعادت کی حیثیت میں اور پیغمبر میں رہنمائی اور ہدایت کی حیثیت میں، یہ ہیں اسماعیلی مذہب کی گہری حقیقتیں۔ آپ دنیا کے سارے مذاہب میں چھان بین کریں، وہاں آپ کو یہ حقیقتیں نہیں ملیں گی۔ ایسی گہری باتیں آپ کو نظر نہیں آئیں گی، صرف اسماعیلی مذہب ہی ہے جس کے اندر ایسی گہری حقیقتیں ہیں، خانہ آبادان، خانہ آبادان۔

سوال: روح کے اِس دنیا میں آنے کا مقصد کیا ہے؟

اپنے عزیز خاکی صاحب کا کہنا ہے کہ انسانی زندگی یا کہ روح کے اِس دنیا میں آنے کا مقصد کیا ہے؟ اِس کا کیا مطلب ہے آیا یہ صرف جہنم اور بہشت کی غرض کی تکمیل کے لئے ہے یا کچھ اس میں اور بات ہے؟ یہی ہے نہ آپ کا سوال! کچھ ایسا!

یہ خوب سوال ہے، اِس لئے کہ اِس کے اندر علم ہے، اِس سوال کے تحت علم کا ایک حصّہ آتا ہے یہ سوال علم کو کافی گھیرتا ہے، تو آپ نے کہا عزیزِ من! کہ مقصد کیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ انسان کے دنیا میں آنے کا ایک مقصد نہیں ہے بلکہ کئی کئی مقاصد ہیں، اِن مقاصد میں ایک مقصد، مقصدِ اعلیٰ کہلاتا ہے یعنی دنیا میں آنے کے اغراض بہت ہیں، کئی کئی ہیں۔ آپ جس غرض کو بھی لیں وہ غرض ہی ہے، کوئی کہہ سکتا ہے کہ دنیا میں ہم اِس لئے آئے ہیں کہ سیارۂ زمین کو آباد کریں یہ بھی ایک غرض ہے لیکن یہ مقصدِ اعلیٰ نہیں ہے، دنیا میں اِس لئے آئے ہیں کہ زندگی گزاریں اور نوعِ انسان کی نسل بڑھے اور دنیا میں قومیں آباد ہو جائیں یہ بھی بات ہے، لیکن نہیں! مجھے معلوم ہے کہ آپ کا سوال جو ہے وہ مقصدِ اعلیٰ سے ہے اور سب سے جو اونچا مقصد ہے اُس کے بارے میں آپ پوچھتے ہیں۔

دیکھئے!! اگر ہم یہ کہیں قرآن کے بموجب وَ مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَ الْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُون (۵۱:۵۶) ہم نے جنّات اور انسان کو پیدا نہیں کیا مگر اس لئے کہ وہ ہماری عبادت کریں اور ہم کو پہچانیں۔ میں یہ دعویٰ کرتا ہوں کہ یہ بھی آخری مقصد نہیں ہے! یہ بھی آخری مقصد نہیں ہے!!، یہ اِس لئے کہ اِس میں خدا کی حاجت مندی کا ثبوت ملتا ہے۔ حالانکہ خدا بے نیاز ہے اگر مانا جائے کہ انسان کی تخلیق اِس لئے ہوئی کہ وہ خدا کی پرستش کرے اور خدا کو پہچانے تو اِس تصور سے خدا کی غرض پائی گئی، ثابت ہوا کہ خدا عبادت کے لئے محتاج ہے، ثابت ہوا کہ خدا معرفت کے لئے، شناخت کے لئے محتاج ہے۔

یہ آخری بات نہیں ہے، آخری بات کچھ اور ہے، وہ یہ ہے کہ انسان جو دنیا میں آیا وہ اپنی غرض سے آیا اور اپنے ہی مقصد کی تکمیل کے لئے آیا۔ لیکن یہ کہنا بہتر نہیں تھا، یہ زیبا نہیں تھا، کہ خدا یہ کہے کہ تم اپنے مقصد ہی کے لئے آئے ہو، بلکہ ادب کا تقاضا یہ تھا کہ اُس میں خدا کا ذکر ہو اور عبادت کا نام لیا جائے اور سب جانتے ہیں کہ عبادت اگرچہ منسوب خدا سے ہے لیکن فائدہ اُس کا انسان کو ہے۔

لہٰذا اگر انسان عبادت کرتا ہے تو وہ خدا کے لئے نہیں کرتا ہے۔ ظاہر میں وہ خدا کے لئے کرتا ہے، لیکن حقیقت میں وہ خدا کے لئے نہیں کرتا وہ اپنے فائدے کے لئے کرتا ہے اور خدا کی یہ عظیم رحمت ہے کہ اپنے اُوپر احسان رکھتا ہے۔ کہتا ہے کہ تم نے میری عبادت کی یہ ایک قسم کی رحمت ہے، اسی طرح اسی مقصد کے پس منظر میں کہ خدا کی پرستش کے لئے جنّات اور انسان کو پیدا کیا گیا ہے وہ مقصد پوشیدہ ہے جو انسان کا اپنا ہی مقصد ہے اور وہ یہ ہے کہ دنیا میں آئے اور خدا کی رحمتوں اور مہربانیوں کا مستحق قرار پائے وہ اسی لئے آیا ہے اور اِس کے بغیر یہ ممکن نہیں تھا کہ اُس کا کوئی کارنامہ بنے، گو کہ خدا کسی

خدمت کے بغیر بھی انسان کو نواز سکتا تھا کسی کارنامے کے بغیر بھی اُس کو بہت کچھ عنایت کر سکتا تھا لیکن اِس میں مزہ نہیں تھا، اُتنا جتنا کہ انسان کے اپنے کارنامے کے انجام دینے پر ہوتا ہے، گو کہ اِس میں خدا ہی دیتا ہے اُس میں بھی خدا ہی دیتا لیکن مزہ اِس میں ہے کہ خدا مدد کرے اور انسان اپنا کوئی کارنامہ قائم کرے پھر مزہ ہے۔

کسی دوسرے کے بنائے ہوئے گلشن میں جا کر سیاحت کریں تو ہم کو تھوڑا سا مزہ آئے گا اور اگر ہم اپنے آپ سے کوئی گلشن، گلستان بنائیں، چمن بنائیں، باغ لگائیں اور اس میں جا کر سیاحت کریں تو بہت ہی مزہ آئے گا، بہت ہی مزہ آئے گا اور اسی لئے خدا نے انسانوں کے لئے پہلے سے جنّت تیار کر کے نہیں رکھی ہے اور دوزخ بھی اُس نے تیار نہیں کی ہے اگر چہ قرآن کا یہ ارشاد ہے کے اُعِدَّت (۳:۱۳۳) تیار کیا گیا ہے۔ دوزخ کے بارے میں بھی فرمایا گیا ہے اور بہشت کے بارے میں بھی فرمایا گیا ہے کہ دوزخ جو ہے وہ بدکاروں کے لیے تیار کی گئی ہے اور جنّت جو ہے وہ پرہیز گاروں کے لئے تیار کی گئی ہے، لیکن مطلب اِس کا یہ ہے کہ اِن کے اپنے اعمال ہی سے دوزخ بھی تیار ہو جاتی ہے اور بہشت بھی، تو کہنا یہ ہے کہ انسان اِس دنیا میں اپنی غرض کے لئے آیا ہے کہ وہ بے شک روح کی شناخت حاصل کرے، خدا کی شناخت حاصل کرے اور اپنے اعمال کا عظیم کارنامہ انجام دے تا کہ اس کے صلے کے طور پر، اِس کے بدلے کے طور پر اُس کو دائمی سلطنت حاصل ہو۔

کائنات پر نظر رکھو، ارشادِ خداوندی ہے: سَنُرِيْهِمْ آيَاتِنَا فِيْ الْآفَاقِ وَ فِيْ أَنفُسِهِم۔ (۴۱:۵۳) اِس کائنات کو دیکھو اِس کے اندر میری آیتیں، میری نشانیاں بکھری ہوئی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے حملة العرش ہیں (۴۰:۷) یعنی عرش کے اٹھانے والے یہ فرشتے ہیں جو عظیم ہیں اور عظیم ہیں اچھا! اگر ہم یہ مانیں کہ خداوندِ عالم نے اِن فرشتوں سے کہا جو عرش کے اٹھانے والے ہیں جو عقلِ کل ہے جو نفسِ کُل ہے اِن فرشتوں سے کہا کہ میں روئے زمین پر ایک خلیفہ بنانے والا ہوں اور ہم یہ مانیں کہ عقلِ کل نے اعتراض کیا نفسِ کل نے اعتراض کیا، عرش کے اٹھانے والے فرشتوں نے اعتراض کیا، جبرائیل نے اعتراض کیا، میکائیل نے اعتراض کیا، اسرافیل نے اعتراض کیا، اِن کو یہ نادانی کیسے آگئی! حالانکہ یہ علم کے فرشتے ہیں، نور کے فرشتے ہیں اور ازل سے لے کر ابد تک عظیم فرشتے ہیں، یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ چیزوں کے نام بھی نہیں جانتے تھے، یہ کیسے ممکن ہے کہ خدا کی منشاء کے خلاف چلتے تھے، یہ کیسے ممکن ہے کہ انہوں نے اعتراض کیا، خدا کی مصلحت میں یہ بات نہیں ہے۔ جو کچھ ہوا یہاں ہوا، جو کچھ ہوا کسی امام کے زمانے میں اور مریدوں کے درمیان ہوا، یہ پوری کائنات کی بات نہیں ہے یہ سیارۂ زمین کی بات ہے یا یہ کہ اِس شخصی عالم کی بات ہے۔

حسّی اور عقلی معجزات:

[کچھ معجزات کا] تعلق حواسِ ظاہر سے ہوتا ہے یعنی آنکھ سے، کان سے، سونگھنے سے اور سننے سے یہ حسّی معجزات ہیں اور کچھ معجزات عقلی ہیں جن کا عقل ادراک کرتی ہے، عقل پاتی ہے۔ عقل کے ذریعے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ معجزات ہیں تو دیکھا! اِن میں کون سے مفید ہیں ہنگامی یا دائمی، عقلی یا حسّی؟ حسّی چیز مثلاً فرض کریں کہ حضرت موسیٰؑ نے لاٹھی سے اژدھا بنا کے دکھایا تو یہ حسّی معجزہ تھا جس کا تعلق آنکھ سے تھا اور نیز حضرتِ موسیٰؑ کے زمانے میں دریائے نیل جو ہے وہ دو حصّوں میں بٹ گیا جو اُوپر کا حصّہ ہے وہیں پر رُکا اور جو بہنے والا حصّہ ہے وہ تو بہہ گیا اور درمیان سے خشک رستہ پیدا ہو گیا یہ بھی حسّی معجزہ تھا۔

اگر مانا جائے کہ حضرت عیسیٰؑ لوگوں کو، نابیناؤں کو بصیرت دیتا تھا، بصارت دیتا تھا، بینائی عطا کرتا تھا تو یہ بھی کچھ دائمی نہیں ہے ہنگامی ہے، ایسے لوگوں کو کچھ دائمی فائدہ نہیں ہے۔ اِس کے برعکس ہمارے پیغمبرِ اکرمؐ نے معجزات نہیں کئے یا بہت کم کئے جو دوسرے انبیاء نے کئے اور اِن معجزات کی جگہ پر آنحضرتؐ نے دو معجزے کئے جو دائمی اور عقلی تھے۔

ایک معجزہ معجزۂ قرآن ہے، انہوں نے ایک ایسی کتاب پیش کی جس کے پیش کرنے سے جنّ وانس عاجز تھے اور دوسرا معجزہ ایک ایسے جانشین کا انتخاب کیا کہ اُس جیسا جانشین کسی نے پیش نہیں کیا، اور رہتی دنیا تک یہ دونوں معجزے دائم اور قائم رہیں گے، یہی دو معجزے عقلی بھی ہیں اور دائمی بھی، اُن سے لوگوں کو فائدے ہیں اور اِس سلسلے میں ایک اہم بات یہ ہے کہ لفظِ معجزہ کی تحلیل کرنا ہے کہ معجزہ کسے کہتے ہیں، معجزہ کی Root عجز سے ہے، ع۔ج۔ز عجز اور معجزہ ایک ایسا کام جس کے کرنے سے دنیا بھر کے لوگ عاجز ہیں۔ اِس معنی میں امام جو کچھ کام کرتا ہے اُس سے لوگ عاجز ہیں، آپ بھی جو قرآن کے بھیدوں کو ظاہر کرتے ہیں اگر یہ بات صحیح ہے تو یہ آپ کا علمی معجزہ ہے، عقلی معجزہ ہے اس کے کرنے سے دنیا بھر کے لوگ عاجز ہیں۔

ہمارے پیر، بزرگ، اسماعیلی دانشور ایسے گزرے ہیں اور اب بھی ہو سکتے ہیں جو معجزے کر سکتے ہیں، لیکن عقلی معجزے، علمی معجزے یعنی ایسے دلائل پیش کرتے ہیں کہ جن کے پیش کرنے سے دنیا والے عاجز ہیں، قرآن کے ایسے اسرار ایسے بھید ظاہر کر سکتے ہیں جن کے ظاہر کرنے سے دنیا والے عاجز ہیں۔ قرآن کی ایسی مشکلات کا حل بتاتے ہیں کہ جن کا حل بتانے سے دنیا والے عاجز ہیں۔ مشکلات کے حل کا کیا مطلب؟ قرآن کے اندر ایسی ایسی سورتیں ہیں جن کے معنی کوئی بھی نہیں بتا سکتا، کوئی نہیں بتا سکتا، اس کو لوگوں نے تسلیم کیا ہے۔ ایک اصطلاح بنائی ہے مشکلاتِ قرآن یہ اس کی اصطلاح ہے، لوگوں نے تسلیم کیا ہے کہ قرآن کے اندر مشکلات ہیں، اس مشکل کو کوئی آسان نہیں کر سکتا ہے، سوائے وہ شخص جس کو امام سے

تائید حاصل ہو۔ مثلاً حروفِ مقطعات کے معنی بتانا اور معنی ایسے ہوں کہ لوگ تسلیم کریں، عقل تسلیم کرے۔

یہ قرآن کے معجزے ہیں، ہم کو ایسے معجزے چاہئیں، ہم کو ایسا معجزہ نہیں چاہیے کہ یکا یک یہاں سے ایک روشنی پیدا ہوگئی پھر وہ بجھ گئی، سب لوگوں نے دیکھا کہ ایک Light پیدا ہوگئی، ہم اِس کو کیا کریں گے؟، اِس سے کیا فائدہ ہوگا؟ یقین بڑھ جائے گا اور بے یقینی بھی ہوسکتی ہے، اِس کو کوئی جادو بھی قرار دے سکتا ہے، اِس سے لوگ گمراہ بھی ہوسکتے ہیں۔ موسیٰؑ نے جو معجزے کئے کیا اُس کے نتیجے میں سب لوگ راہ یاب ہو گئے؟ عیسیٰؑ جو معجزے کرتے تھے اُس کے نتیجے میں کتنے لوگ ایماندار ہو گئے؟ اگر مان لیا جائے کہ آنحضرتؐ نے چاند کے دو ٹکڑے کر دیے، تو کتنے لوگ مان گئے؟ ابو جہل نے، ابولہب نے اور دوسرے قریش کے مشرقین نے قبول کیا؟ نہیں کیا!۔ اِس کے علاوہ معجزات ظاہری بھی ہیں اور باطنی بھی ہیں، معجزات کے سلسلے میں یا معجزات پر کچھ بولنا ہے تو اِس کے Background کو اور اِس کی تفصیلات کو، اِس کی اصطلاحات کو جاننا ہے۔ میں نے مفتاح الحکمت کی کتاب میں ایک مضمون معجزات کے لئے مخصوص کیا ہے۔ [مضمون ''تحقیقاتِ معجزات صفحہ:۴۲'']

سوال: سر آپ حروفِ مقطعات کی کچھ وضاحت فرما دیجیے؟

جواب: حروفِ مقطعات کُچھ Letters ہوتے ہیں کُچھ حروف ہوتے ہیں، اِن کا کیا مطلب ہے لوگ ظاہر نہیں کر سکتے ہیں، ہم سے جو کُچھ ہوسکا حروفِ مقعطات کے بارے میں رسالہ بنایا ہے۔

آج کے دور میں علمی خدمت کی قدر و منزلت:

آپ چاہیں تو میں دو چار الفاظ میں بتا سکتا ہوں کہ وقت کا جو تقاضا ہے وہ بہت ہی اہم چیز ہے اسلام میں اور خصوصاً اسماعیلی مذہب میں۔ وقت کا جو تقاضا ہے، اُس کا فلسفہ یہ ہے کہ دیکھیں کہ رسول اللہؐ کے زمانے میں زیادہ سے زیادہ ثواب کس میں تھا؟ غلاموں کے خریدنے میں اور اُن کو آزاد کرنے میں، غریبوں کو کپڑا پہنانے میں اور اسیروں کو چُھڑانے میں اور محتاجوں کو، ناچاروں کو کُچھ کھلانے پلانے میں، یہ اُس زمانے کے لحاظ سے بڑی فضیلت کی بات تھی اور بڑا ثواب تھا۔ لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا اب اِس وقت بھی اسلام ہے تو اسلام میں اِن چیزوں کی کوئی اہمیت ہے؟ کہاں ہے اہمیت وہ چیزیں کہاں ہیں؟ اب غلام کہاں ہیں؟ وہ کنیزیں کہاں ہیں؟ اور ایسے لوگ کہاں ہیں جو صرف روٹی کے لئے محتاج ہوں؟

اب تو زیادہ سے زیادہ ثواب اِس میں ہے کہ آپ کسی کو علم اور ہُنر سے آراستہ کریں کسی ادارے سے تعاون کریں، آپ کے پاس اگر دو پیسے ہیں تو وہ کسی ادارے سے منسلک کریں اپنی مدد کو اپنی دولت کو۔ آپ کے پاس اگر کارِ خیر کا ایک قطرہ ہے تو وہ قطرہ اُس ندی میں ڈالیں جو جماعتی طور پر بہہ رہی ہے یا کسی ادارے کے وسیلے سے بہہ رہی ہے، تو آپ کا

قطرہ اکیلے کیا کام کر سکے گا؟ بارش برسائے گا؟ کشتی چلائے گا؟ مچھلی پیدا کرے گا؟ کُچھ بھی نہیں کرے گا، قطرہ ہے آخر اُس کو ندی میں ڈالیں یا دریا میں، سمندر میں بھی ڈالیں ٹھیک ہے ایک تو وہ قطرہ قائم و دائم رہے گا، فنا نہیں ہوگا ایک یہ کہ بس اتنا ہی اضافہ ہوگا جتنا کہ قطرہ ہے۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ کارِ خیر جو اچھا کام ہے وہ وقت کے مطابق ہونا چاہیئے۔

آپ جہاد کو لیں، رسول اللہؐ کے زمانے میں جہاد کی کتنی اہمیت تھی، بہت بڑی اہمیت تھی، بہت بڑی اہمیت تھی! لیکن کیا اِس وقت بھی آپ جہاد کر سکتے ہیں؟ نہیں کر سکتے ہیں۔ جہاد صحیح معنوں میں وہ ہے جو پیغمبرؐ کی رہنمائی میں ہو یا امامؑ کی سرداری میں ہو، جب جہاد جسمانی نہیں ہے تو کیا اب اِس زمانے میں ثواب کا وسیلہ ختم ہوگیا؟ اب کوئی بھی فضیلت نہیں ہے؟ نیک کام کے لئے کوئی موقع نہیں ہے؟ دیکھا! اِس سے ہم کو ایک ایسا فلسفہ ملا جس کے ذریعے سے ہم یہ سمجھ سکتے ہیں کہ اِس زمانے کے اندر کس چیز کی زیادہ اہمیت ہے اور رسول اللہؐ کے زمانے میں کس چیز کی زیادہ اہمیت تھی؟

میں عرض کروں گا کہ اِس زمانے میں علم کی سب سے زیادہ ضرورت ہے، اگر آپ کسی کو علم مہیا کرتے ہیں تو سمجھ لیجیئے کہ کسی مُردے میں جان ڈالتے ہیں، کسی مُردے میں روح پھونکتے ہیں۔ آپ اگر علم کی خدمت انجام دیتے ہیں تو سمجھ لیجیئے کہ آپ ایک نابینا کو آنکھ دیتے ہیں، ایک مریض کو شفایاب کرتے ہیں، لنگڑے کو پاؤں عنایت کرتے ہیں، لُولے کو ہاتھ بخشتے ہیں، مفلس کو غنی کر دیتے ہیں، نادار کو دولت عطا کرتے ہیں، یتیم کو لباس مہیا کرتے ہیں، بھوکے کو غذا کھلاتے ہیں، ننگے کے لئے لباس کا بندوبست کرتے ہیں، یتیم کو باپ سے، ماں سے ملا دیتے ہیں۔

علم کی یہ اہمیت ہے، ایک غلام کو جو جہالت کی غلامی میں مبتلا تھا اُس کو آزاد کرواتے ہیں، ایک اسیر کو قیدی کو چھڑاتے ہیں اور ایک ایسے فرد کو جو رستے سے بھٹکا ہُوا تھا اُس کو رستے پر لاتے ہیں، علم کے اندر یہ ساری فضیلتیں جمع ہو جاتی ہیں اور ساری تاویلات علم میں موجود ہیں، سب نیکیاں ہیں۔ کیونکہ علم ہی ہے جو آنکھ ہے، پاؤں ہے، جو کان ہے، جو ہاتھ ہے، جو دولت ہے، سب کُچھ ہے، علم کیا نہیں ہے؟ علم سب کُچھ ہے۔

نوٹ: ناچیز نے استاد بحرالعلوم صاحب کی مدد اور رہنمائی سے اِن خزائنِ علمی سے استفادہ حاصل کرنے کی غرض سے اِسے تحریر میں لانے کی حقیر کوشش کی ہے۔ ٹائپ: اکبر، پروف: نسرین اکبر

استادِ بزرگوار علّامہ نصیر الدّین نصیرؔ ہونزائی (قس)
کا پُرحکمت بیان
عنوان: علم کے بارے میں چند اہم نکات

Click here for Audio

کیسٹ نمبر: ۴ تاریخ: ۱۹۷۷ء

مقام: کراچی دورانیہ: ۶۰ منٹ

علم کے معنی اور اِس کی حقیقت:

اب ہم علم کے سلسلے میں کُچھ جنرل باتیں کرنا چاہتے ہیں، تاکہ شاید اِس میں کُچھ مفید باتیں سامنے آجائیں اور اُس سے فائدہ ہو تو عربی میں علم جاننے کو کہتے ہیں، اِس جاننے سے ہم کچھ بھی مُراد لے سکتے ہیں۔ علم کے معنی جاننا، کوئی بھی بات جاننا، کوئی بھی کام جاننا، خواہ یہ سائنس سے متعلق ہو یا جغرافیہ سے یا کوئی بھی مضمون، کوئی بھی علم، کوئی بھی Subject تو یہ عام سے عام ہے۔ لیکن دین کے مقام پر علم سے کُچھ ایسی حقیقتوں کا جاننا مُراد ہے کہ وہ حقیقتیں عقل کے لئے، روح کے لئے، دین کے لئے، ایمان کے لئے بہت ہی اہمیت رکھتی ہیں۔ تو اہلِ دین کے نزدیک علم کے کُچھ ایسے معنی ہیں۔

حقیقی عالم کی پہچان:

اِس کا مطلب یہ ہُوا کہ جو لوگ علم کا دعویٰ رکھتے ہیں اور خود کو عالم بھی کہلاتے ہیں لیکن وہ حقیقت سے ناواقف ہیں تو ہم اُن کو عالم نہیں کہیں گے، بلکہ اُن کو ہم جاہل کہیں گے، کیونکہ مقصد کی بات وہ نہیں جانتے ہیں، یعنی جن چیزوں کو جاننا چاہیے وہ نہیں جانتے ہیں۔ دیکھا! اِس وضاحت سے آپ کو کیسی اچھی بنیادی بات واضح ہوگئی۔ دنیا کے اندر بہت سے لوگ ہیں جن کو عام لوگ علم والے کہتے ہیں یا عالم کہتے ہیں، عالم و فاضل مانتے ہیں، لیکن اُن لوگوں کو حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں، اِس سے لوگوں کو دھوکا ہوسکتا ہے۔ وہ اِس معنی میں کہ عوام ایسے لوگوں کو عالم مانیں، فاضل تسلیم کریں، لیکن مطلب کی بات اُن سے دُور رہے۔ اِس کے برعکس کُچھ ایسے لوگ ہوں جو حقیقت کو جانتے ہیں لیکن عالم نہیں کہلاتے ہیں، چونکہ دنیوی طور پر کوئی نام کوئی ٹائٹل نہیں ہے، یہ تو شہرت کی بات ہے، مثال کے طور پر جو اہلِ حقیقت ہیں، جو ہمارے پیر بزرگ گُزرے ہیں، اُن کو بہت کم لوگ تسلیم کرتے ہیں یا سِرے سے دُوسرے لوگ تسلیم ہی نہیں کرتے۔ تو کتنی محرومی کی بات ہے کہ جن کو عالم کہنا چاہیے تھا اُن کو عالم نہیں کہا جارہا ہے، یعنی جاننے والے اِدھر رہ گئے اور نہ

جاننے والے عالم کہلائے۔ اِس سے لوگوں کو دھوکا ہوگیا، غلط فہمی ہوگئی اور دنیا میں ہمیشہ ایسا ہی ہُوا کرتا ہے۔

اِس کے علاوہ علم کے معاملے میں ایک اور دھوکا یہ ہوتا ہے کہ لوگ ظاہری الفاظ کی خوبصورتی کی طرف جاتے ہیں وہ صَرف ونحو کی طرف جاتے ہیں، وہ چُن چُن کہ الفاظ کو استعمال کرتے ہیں وہ لغت کی پیروی کرتے ہیں، وہ زبان کو زیادہ اہمیّت دیتے ہیں۔ اِس سے بھی بعض دفعہ لوگوں کو دھوکا ہوتا ہے کہ وہ اِن ہی ظاہری خوبیوں میں مبتلا ہو کر اصل مقصد سے دُور رہ جاتے ہیں۔

ایک اور چیز جو خطرناک ہے وہ ظاہری شہرت ہے، دُنیا کے اندر جن لوگوں کی زیادہ شہرت ہے، عوام کا رُجحان اُن کی طرف ہے، اُن ہی کی پیروی کرتے ہیں، انہیں مستند قرار دیتے ہیں اور اُن کے اقوال اور کتابوں کو پڑھتے ہیں۔ بہرحال مختصربات یہ ہے کہ دنیا ایک ایسی جگہ ہے کہ اِس میں اگر ہوشیاری سے کام نہ لیا جائے تو ہمیشہ خسارہ ہی خسارہ ہوسکتا ہے، لیکن جو اہلِ ایمان ہیں وہ کس قدر خوش نصیب ہیں کہ وہ راہِ مستقیم پر ثابت قدمی سے چلتے رہتے ہیں، وہ ہادیٔ برحق کے پیرو ہیں، اُن کو بصیرت ملی ہے، یعنی دل کی آنکھ، جس سے کام لے کر ہمیشہ یہ حقیقتوں کے متلاشی رہتے ہیں۔

تو علم سے فائدہ اُٹھانے کے لئے اِن تمام باتوں کا جاننا ضروری ہے، تاکہ ہم اپنے ہی رستے سے مطمئن ہو جائیں اور پھر دوسروں کی طرف ہماری نگاہیں نہ اُٹھیں اور اگر اُٹھتی بھی ہیں تو تنقیدی طور پر یہ دیکھنے کے لئے کہ اُن سے کہاں بھول ہوگئی ہے اور کیسے غلط رستے اختیار کئے گئے ہیں۔ اِس کے لئے اگر Research کے طور پر ہم دوسروں کی کتابوں کو پڑھتے ہیں تو اِس میں کوئی عیب نہیں ہے۔ لیکن اِس کے لئے شرط یہ ہے کہ سب سے پہلے ہمیں اپنے علوم سے آگہی ہونی چاہیے۔ ہمارے پاس کوئی معیار ہونا چاہیے تاکہ اُس معیار سے دوسروں کی باتوں کو پرکھ سکیں، اگر معیار نہ ہو، میزان نہ ہو، ترازو نہ ہو اور کسوٹی نہ ہو تو ہم کس چیز سے دوسروں کے اقوال کو تول سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ امامِ عالی مقام نے ہمیشہ سے اِس بات پر زور دیا ہے کہ ہم اپنے بچوں کو اپنے ہی علوم سے آراستہ کریں، اُن کو اپنی حقیقت سمجھائیں اور اپنے دین کی باتیں اُن کو اِس قدر دیں کہ وہ پوری طرح سے اپنے مذہب کو سمجھیں اور پھر اُن کو کوئی خطرہ نہ رہے کہ وہ بہک جائیں، پھر اِس کے بعد وہ دوسروں پر تنقید کر سکتے ہیں۔

آپ نے توجہ دی ہوگی کہ کُچھ ہمارے لوگ جماعت سے کٹ کٹ کر دوسروں کی طرف جا رہے ہیں، اِس کی وجہ کیا ہے؟ اِس کی وجہ امامؑ نے بہت پہلے بتادی ہے اور فرمایا ہے کہ جو اسماعیلی اپنے دین کی باتوں سے واقف نہ ہوں یا اپنے علوم سے آگاہ نہ ہوں تو وہ دوسروں کے مذاہب میں چلے جاتے ہیں۔ حضرت امام آقا سلطان محمد شاہ صلوات اللہ علیہ کا فرمان ہے: ''تم بچوں کو دین کا علم نہیں سکھاؤ گے تو وہ خراب ہو کر دوسرے دین میں چلے جائیں گے۔ اِس

میں بچوں کا نہیں بلکہ والدین کا قصور شمار ہوگا اور اِس کے علاوہ جماعت کے مُکھی کامڑیا جنہوں نے اِس بات کی خبر نہ لی ہوگی قصوروار سمجھے جائیں گے۔ اِس طرح دین سے آشنا نہ ہونے کی وجہ سے جو لوگ دین سے نکل جائیں گے اُن کا آدھا گناہ والدین پر ہوگا اور آدھا گناہ مُکھی، کامڑیا اور جماعت کے دوسرے عملداروں پر ہوگا، کیونکہ اُن کے کوشش نہ کرنے کی وجہ سے ایسا ہوتا ہے"۔ (راجکوٹ، ۲۱۔۱۰۔۱۹۰۳)۔ بہرحال آپ نے حضرت مولانا امام سلطان محمد شاہ صلوات اللہ علیہ کے ارشادات میں یہ بات پڑھی ہے، تو اِن تمام باتوں کا سمجھنا ضروری ہے۔

علم کے حصول کے لئے بنیادی شرائط:

اب میں کُچھ آگے بڑھ کر ایسی کوئی مفید بات بتاؤں گا کہ جس سے آپ کو یقین ہو کہ واقعاً علم حاصل کرنے سے پہلے، علم کی تیاری کے طور پر کُچھ باتیں سمجھنے کی ہیں، آپ قائل ہو جائیں گے۔ وہ یہ کہ دین کی کتابیں کس طرح پڑھنی چاہیں، دین کی کتابیں جو خاص ہیں، جن میں روحانیت اور اصلیت کا مغز ہے، جن میں حکمت ہے، جن میں حقیقت ہے اور دین کا فلسفہ ہے، اُن کتابوں کو اہتمام سے پڑھنا چاہیے۔ اُن کتابوں کو فراغت کے ایسے وقت میں پڑھنا چاہیے کہ جس طرح کہ ایک حقیقی مومن ذکر کے لئے اہتمام کرتا ہے، عبادت کے لئے اہتمام کرتا ہے۔ کیونکہ ذکر تو ہر وقت کرنا چاہیے لیکن کامیاب ذکر کے لئے مخصوص وقت ہے، اسی طرح مطالعہ کے لئے بھی مخصوص وقت ہے۔ تھوڑا تھوڑا مطالعہ ہر وقت کرنا چاہیے، لیکن خاص مطالعہ ایسے وقت میں کیا جائے جس میں مومن بالکل اطمینان سے بیٹھا ہو اور اُس کو کوئی چیز پریشان نہ کرے، کوئی آواز، کوئی کام، کوئی مداخلت، کوئی Interference نہ ہو، اُس وقت آرام آرام سے بیٹھے اور مطالعہ کرے۔ خصوصاً اگر رات کا وقت ہے سکون کا وقت ہے تو تھوڑا سا شام کے وقت یا رات کے وقت، اگر آپ کی عادت ایسی ہو کہ رات کے ڈھائی بجے یا تین بجے یا ساڑھے تین بجے اُٹھتے ہیں تو اُس میں سے چند منٹ مطالعہ کے لئے مخصوص کریں۔ میں آپ کو ایک مفید مشورہ بتاتا ہوں اور وہ مطالعہ اِس نیت سے کریں کہ مطالعہ کے دوران کُچھ چھوٹا سا معجزہ ہوتا ہے، اُس کے تجربے کے طور پر۔ وہ کیا معجزہ ہوتا ہے اُس کے لئے کامیاب کتابیں چاہیں۔

روحانی علم اور تائید نورانی

آپ صبح نورانی عبادت سے کُچھ وقت پہلے اور نورانی عبادت کے بعد بھی اور صبح جو General دُعا ہے اُس کے بعد بھی آپ یہ Practice کریں کہ اچھی اچھی کتابیں جو ہیں اُن میں سے کسی کتاب کو سامنے رکھیں، اُس میں غور سے، بہت اخلاص سے اور مولا سے مدد اور یاری چاہتے ہوئے اُس کو پڑھیں پھر کیا ہوگا؟ اوّل اُس کی تحلیل ہو جائے گی یعنی اُس کے اندر جو لغوی معنی ہیں جو ظاہری معنی ہیں وہ حل ہو جائیں گے۔ اُس کے بعد اب اور پڑھیں تو پڑھتے

پڑھتے اُس عبارت اور اُس مطلب کی Side سے یا پس منظر سے کُچھ تائید کی جھلکیاں آنے لگیں گی، یکا یک اُس میں سے کوئی معنی کوئی مطلب سمجھ میں آئے گا۔ جو کہ وہ مطلب ظاہر میں نہیں تھا، وہ مطلب یا منطقی طور پر یا کُچھ روحانی تائید کے انداز میں یا القاء کے طور پر یا توفیق کے طور پر، یکا یک کُچھ ایسے معنی دل میں آئیں، اُن الفاظ سے کوئی ایسا مطلب سمجھ میں آنے لگے گا کہ اُس معنی کے سمجھ میں آنے کے ساتھ ساتھ دل پر خوشی کا جھٹکا سا لگے گا۔ لیکن پہلے پہل یہ بات بہت خفیف ہو گی، اِس کا احساس بہت ہی کم ہو گا، جس طرح دنیوی طور پر کوئی زبردست خوشی کا جب احساس ہوتا ہے تو اِس کا جھٹکا لگتا ہے۔

اِس جھٹکا لگنے کی کیا وجہ ہے؟ یہ کہ ہمارے دل کے اندر روحِ حیوانی ہے وہ احساسات کا مرکز ہے۔ دماغ میں جو کُچھ کیفیت گزرتی ہے اُس کا نتیجہ بھی دل میں بعض دفعہ نکلتا ہے اور دل میں جو کُچھ کیفیت ہوتی ہے بعض دفعہ اُس کا نتیجہ دماغ میں نکلتا ہے۔ بہرحال یہ خوشی کا جھٹکا سا جو لگتا ہے اِس کی وجہ یہ ہے کہ کوئی بھی بات ہے، کوئی بھی چیز مل رہی ہے جو اچھی ہے، جو مطلب کی چیز ہے، تو اُس وقت دل پر ایک میٹھی سی چوٹ لگتی ہے، یا کہ جھٹکا سا لگتا ہے، یا یہ کہ زبردست احساس ہوتا ہے یا کسی قدر کم احساس ہوتا ہے، ہم محسوس کرتے ہیں ہم Feel کرتے ہیں کہ دل یکا یک اُچھل رہا ہے اور خوشی سے وہ جاگ رہا ہے اُس کے احساسات جاگ رہے ہیں۔

یہ کیفیت نہ صرف علم کے دوران بلکہ دنیوی معاملات میں بھی گزرتی ہے، یہ آپ نے محسوس کیا ہو گا، اِس کا آپ کو تجربہ ہے۔ تو مطالعہ کے دوران اگر ایسی کیفیت گزرتی ہے تو یہ تائید ہے، تائید معنی روحانی مدد، آپ اِس کو تائید کہہ سکتے ہیں، توفیق کہہ سکتے ہیں، اِس کو القاء بھی کہہ سکتے ہیں ا۔ل۔ق۔ا۔ء، القاء معنی دل میں کوئی بات ڈالنا خدا کی طرف سے۔ ہم فی الحال اِس کو وحی نہیں کہیں گے، لیکن یہ حقیقت وحی سے قریب ہے اور وحی کی ایک ذیلی چیز ہے، وحی بھی تو طرح طرح کی ہوتی ہے، لیکن اُس کی ایک شاخ آواز کے بغیر دل کے اندر سے کوئی معنی اُبھرتا ہے، اچھا! تو اُس حقیقی کتاب کے مطالعہ سے آپ کو ایسی کیفیت ہو گی اور رفتہ رفتہ اِس میں اضافہ ہو جائے گا۔

آپ اپنی نیّت میں اِس کو عبادت بھی قرار دینا اور اِس کو تلاشِ علم بھی قرار دینا اور آپ باور کرنا کہ آپ روحانی ترقی کے سلسلے میں تجربہ کر رہے ہیں، دیکھ رہے ہیں کہ خداوندِ عالم نے ہمارے پیروں کو، بزرگوں کو کس طرح علم دیا، کس طرح اُن کو بصیرت عطا کی گئی اور کس طرح مولا سے ان کا رابطہ قائم ہو گیا، اُس کی آپ ایک ذیلی مشق کر رہے ہیں، رفتہ رفتہ ایک وقت ایسا آئے گا کہ یہ چیز نمایاں ہونے لگے گی کہ اُس عبارت سے یا اُس لفظ سے جو مقرّرہ معنی ہیں، جو سب تسلیم کرتے ہیں اُس کے علاوہ بھی ایک عجیب و غریب مطلب وہاں سے سمجھ میں آنے لگے گا اور اِس سے آپ کو خوشی ہو گی۔

پھر یہ سلسلہ چلتا رہے گا، کتاب کا جتنا حصّہ آپ پڑھتے ہیں اُس میں خوشی محسوس ہو گی اور روحانیت کی توفیق کی

جھلکیاں آنے لگیں گی۔ رفتہ رفتہ اِس کی کیفیت یہ ہوگی کہ بعض دل و دماغ کی سطح کو ایسی کوئی بات جب چُھونے لگے گی تو یکا یک اُس میں سے ایک علم کا خاکہ آپ کے سامنے آئے گا۔ ایک پورا نقشہ، ایک پورا لیکچر، ایک پورا مطلب، ایک پوری بات تفصیل کے ساتھ اُسی ایک چیز سے۔ اِس کی مثال یوں ہے کہ جس طرح سائنس نے ثابت کیا ہے کہ ذرّہ کو پھاڑنے سے ایک زبردست دھماکہ، ایک زبردست طاقت پیدا ہوتی ہے، اِسی طرح روحانی طور پر بھی علم کے ایک ذرّے کے فنا ہونے سے ہمارے دل کے اندر بہت روشنی اور بہت کُچھ علم آتا ہے اور رفتہ رفتہ یہ کام آگے بڑھے گا اور اِس میں ترقی ہوگی۔ پھر آپ لازماً عادی ہو جائیں گے اور پھر علم سے آپ کی وابستگی ہوگی ایک طرف سے اور دوسری طرف سے جہاں آپ کو ذکر کا شوق تھا، عبادت کا جذبہ تھا اُس میں اضافہ ہو جائے گا یہ آپ کی عبادت بھی بنے گی، کیونکہ عبادت کوئی ایک چیز نہیں ہے۔ عبادت کی بہت سی شاخیں ہیں یعنی اِس نیّت سے علم کا حصول کہ آپ دین کی حقیقتوں کو سمجھنا چاہتے ہیں، آپ مولا کے قریب جانا چاہتے ہیں، اِس نیّت سے جو مطالعہ کریں گے اور جو علم کی باتوں کو اپنائیں گے وہ بھی عبادت ہے۔ لیکن یہ جو میں نے آپ کو بتایا وہ ہر کتاب میں نہیں ہوگا، دوسروں کی کتابوں میں یہ معجزہ نہیں ہوگا، آپ کی اپنی جو حقیقی کتابیں ہیں، جو عمدہ کتابیں ہیں، جو اعلیٰ درجے کی کتابیں ہیں، جیسے سب سے پہلے فرامین، گنان اور بزرگانِ دین کی کتابیں اُن میں یہ بات ہوگی۔ دوسروں کی کتابوں سے یہ بات اِس لئے نہیں ہوگی کہ ہمارے دلوں میں شکوک پیدا ہوں گے، ہم یقین نہیں کرسکیں گے کہ اِس کے یہ معنی ہیں اور لکھنے والے نے یہاں یہ مُراد رکھی ہے اور اِس سے مصنّف کی مُراد یہ ہوسکتی ہے اور انہوں نے یہ مفہوم یہاں رکھا ہے وغیرہ وغیرہ، ایسے خیالات نہیں آئیں گے اور یہ جو ہوگا صرف اپنی کتابوں ہی سے ہوگا۔ میں نے کہا تھا کہ یہ معجزہ ہے اور بہت چھوٹا سا معجزہ ہے، بلاشک یہ معجزہ ہے اور معجزہ ذرّے سے شروع ہو جاتا ہے۔

معجزہ ابتدا میں بہت ہی چھوٹا ہوتا ہے، یہاں تک کہ اُس کو کوئی گمان ہی نہیں کرتا ہے کہ یہ معجزہ ہے، دنیا کی کوئی بھی چیز ایسی نہیں ہے جس کا آغاز ذرّے سے نہ ہو۔ ذرّے سے ہر چیز ہے، یہاں تک کہ پوری کائنات بھی ذرّات کا مجموعہ ہے۔ لہٰذا اگر آپ کو معجزہ دیکھنا ہے تو سب سے پہلے آپ ذرّے سے معجزہ دیکھنا شروع کریں اور علم کا معجزہ ذرّے سے شروع کریں، ایک دفعہ آپ کو ذرّہ بھر معجزہ ہوگا، بڑا معجزہ نہیں ہوگا، زیادہ نہیں ہوگا، ذرّہ بھر ہوگا۔ لیکن اِن ذرّات کے مجموعے سے ایک دن آپ کے سامنے کوئی بڑی چیز آئے گی، کوئی بڑا معجزہ گزرے گا۔

حقیقی علم میں خوشی کا پہلو:

دوسری بات جو میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں یہ خوشی آپ کو کیوں ہو گی؟ کس وجہ سے آپ خوشی محسوس کرتے ہیں؟ کسی اچھی بات سے جو روحانیّت کی بات ہو، علم کی بات ہو، حقیقت کی بات ہو، امام شناسی کی بات ہو، اُس سے آپ جو خوشی محسوس کرتے ہیں، اُس کی وجہ کیا ہے؟ اُس کے پس منظر میں کیا ہے؟ اُس کا اصل سبب کیا ہے؟ دیکھیں اُس سے روح بنتی ہے، حقیقی روح، وہ خوشی گواہی ہے وہ خوشی شہادت ہے وہ خوشی دلیل ہے کہ آپ کے اندر جو اصلی روح ہے اُس میں اضافہ ہو رہا ہے، وہ روح مضبوط سے مضبوط تر ہو رہی ہے۔ اِس کی مثال مادّی طور پر میں یہ پیش کرونگا کہ جب آپ کو کھانے کے لئے خوب اشتہا ہوتا ہے اور عین اُس وقت اچھے کھانے پر بیٹھتے ہیں تو ہر لقمہ سے آپ کو لذّت محسوس ہوتی ہے، تو اِس قسم کی جو لذّت محسوس ہوتی ہے، اُس کے اندر کیا معنی ہیں؟ وہ یہ معنی ہیں کہ آپ کی روحِ حیوانی میں اضافہ ہو جاتا ہے، آپ کے اندر جو روحِ حیوانی ہے وہ قوی ہو جاتی ہے۔

بالکل اِسی طرح جب آپ علم اور حکمت کی باتوں سے خوشی محسوس کرتے ہیں تو یہ خوشی شہادت ہے، یہ خوشی اِس بات کی علامت ہے کہ آپ کے اندر جو روحُ الایمان ہے، جو ایمان کی روح ہے، جو حقیقی روح ہے، جو روحُ القدس ہے وہ بنتی ہے۔ اُس کی تخلیق ہوتی ہے، اُس کو ایک جُز ملتا ہے، خواہ چھوٹا ہو یا بڑا ہو، اُس کو ایک جُز ملتا ہے، اُس کو غذا مہیا ہوتی ہے۔ اِن خوشیوں سے جو اُس کی منشاء کے مطابق ہے، تو اِس سے میں کیا بتانا چاہتا تھا، میں یہ چاہتا تھا کہ جب مطالعہ میں اور اچھی نصیحت میں اور اچھے لیکچر میں جو دین سے متعلق ہو، جب آپ کو خوشی محسوس ہوتی ہے، تو آپ کو مبارک ہو کہ آپ کے اندر جو روح ہے وہ بن رہی ہے، اُس کی تخلیق ہوتی ہے، اُس میں اضافہ ہو جاتا ہے، وہ طاقتور ہوتی ہے۔

انسان میں مختلف روحوں کی تخلیق:

ایک اور اہم بات میں بتاؤنگا وہ یہ کہ آپ کو یاد رہے کہ جو حقیقی روح ہے، اُس کی غذا یہاں اِن دونوں کانوں سے مہیا ہوتی ہے، جو حقیقی روح ہے اور جو نفس حیوانی ہے اُس کی غذا یہاں سے مُنہ سے ہے، تاکہ آپ کو یہ بھی معلوم کہ ہر روح کے لئے ایک الگ غذا ہے اور سب سے پہلے جو روحِ نباتی ہے، گھاس، پات، درخت والی روح وہ بنتی ہے، اُس روح کو ناف کے رستے سے غذا مہیا ہوتی ہے اور روحِ حیوانی کو یہاں سے یعنی مُنہ سے غذا مہیا ہوتی ہے۔

یہ بات ذرا تفصیل طلب تھی، وہ یہ کہ ڈاکٹری میں یا کسی متعلقہ مضمون میں آپ نے پڑھا ہوگا، سنا ہوگا کہ جب بچہ ماں کے پیٹ میں ہوتا ہے تو اُس کو غذا مہیا ہوتی ہے، آپ نے کبھی پوچھا ہے، کبھی سوچا ہے، کبھی پڑھا ہے کہ اُس کو کہاں سے غذا مہیا ہوتی ہے؟ آیا وہ مُنہ سے خوراک کھاتا ہے، نہیں مُنہ تو اُس کا بالکل بند ہوتا ہے، پھر کہاں سے اُس

کو ناف کے رستے سے غذا مہیا ہوتی ہے۔تو دیکھا آپ نے کہ انسان اپنی غذا کو ہر وقت تبدیل کرتا ہے، وہ غذا کھانے کے لئے جو رستہ ہے اُس کو بھی تبدیل کرتا ہے، تو نَو (۹) مہینے تک تقریباً وہ ناف کے رستہ سے غذا کھاتا تھا۔جب دنیا میں پیدا ہوگیا تو مُنہ کے رستے سے کھانا شروع کیا۔لیکن پیدا ہونے کے بعد بھی وہ روحانی غذا سے بے خبر ہوتا ہے وہ روحانی غذا نہیں کھاتا ہے وہ جسمانی غذا کھاتا ہے، اِس سے اُس کی Body بنتی ہے، اُس کا جسم بنتا ہے۔

آگے چل کر بات کرنے کی جو روح اُس میں بن رہی ہے، اُس کے لئے یہاں سے یعنی کان سے باتوں کو سنتا ہے۔دو ڈھائی سال، تین سال، پانچ سال تک اِن کانوں سے اُس کو ایک غذا مہیا ہوتی ہے، وہ گفتگو کی غذا ہے، ماں، باپ، بہن، بھائی، بچہ سے باتیں کرتے ہیں تو اُن کی وہ باتیں اُس کے کانوں میں سے گزر کر دل و دماغ میں وہ گونجتی ہیں تو اُن ہی باتوں میں سے وہ اپنے لئے بولنے والی روح فراہم کرتا ہے، اِس کے لئے کافی وقت لگتا ہے، دو ڈھائی سال، تین سال، چار، پانچ سال، پھر بھی اُس میں عقل نہیں ہوتی ہے۔

عقل والی روح اُس میں کب مکمّل ہوتی ہے؟ تقریباً پندرہ (۱۵) برس تک، تو اُس عقل والی روح کی تخلیق کے لئے غذا کہاں سے مہیا ہوتی ہے؟ وہ بھی انہی کانوں سے۔تو کتنی روحیں اُس میں بن گئیں؟ ہم نے عقل کو بھی مثال کے طور پر ایک روح قرار دیا۔سب سے پہلے گھاس پات والی روح تھی، اُس کے بعد روحِ حیوانی تھی، اُس کے بعد بولنے والی روح تھی، اُس کے بعد اگر ہم عقل کو بھی ایک روح قرار دیں، تو یہ چوتھی روح ہوگئی۔تو تب تک یہ اِن کانوں سے غذا کو حاصل کرتا ہے، نفس نباتی اور نفس حیوانی کے لئے غذا تو مُنہ سے کھاتا تھا، بولنے والی روح اور عقل والی روح کے لئے غذا اُس نے کہاں سے حاصل کی؟ یہاں سے یعنی کان سے۔

یہاں پر ایک مثال میں آپ کو پیش کرونگا، ایک ایسے بچے کو جو ابھی ابھی پیدا ہُوا تھا، آپ کسی جنگل بیابان میں ایسا اہتمام کریں اور اُس کے ساتھ کوئی بات نہ کریں، بس اُس کو دودھ پلایا جائے اور بات اُس سے نہ کی جائے، پرورش خوب ہو تو وہ دس، پندرہ برس ہونے کے باوجود بات نہیں کرسکے گا۔کیونکہ آپ نے اُس کو بات کرنے والی روح نہیں دی وہ کیسے بات کرے گا وہ بات نہیں کرسکے گا، آواز ہوگی اُس میں جانوروں کی طرح۔پھر اگر ایسے بہت سے لوگ ہوں تو پھر کُچھ عرصے کے بعد، کتنے برس کے بعد آپس میں اشارے کریں گے اور کرتے کرتے شاید ہوسکتا ہے کہ عرصۂ دراز کے بعد اُن میں بات کرنے والی روح پیدا ہو جائے۔نہیں تو وہ بات نہیں کرسکیں گے، اِس لئے کہ آپ نے تو اُن کو، اُن بچوں کو جن کو آپ نے اہتمام سے جنگل بیابان میں پالا تھا بات کرنے والی روح نہیں دی۔تو دیکھا کہ گھر میں جو بچہ پیدا ہوتا ہے اُس کو روح کس طرح مہیا ہوتی ہے، بولنے والی روح اور عقل والی روح، بس اُسی خاندان سے اور اُسی فیملی سے اور اگر باہر کے بھی کُچھ لوگ ہیں تو اُن سے یہ ایک مجموعی خوراک اُن کو مہیا ہوتی ہے۔کسی ایک سے

نہیں تو پھر گھر کی حالت جو بھی ہو گی اُس کے مطابق گھر کا بچہ بولنے لگے گا، زبان بھی وہی سیکھے گا اور عقل بھی اسی طرح سے سیکھے گا۔ اب اِس کے بعد آپ کو یقین آیا کہ دین اور ایمان والی روح یا روحُ القدس کو بھی غذا یہاں سے مہیا ہو جاتی ہے، یہاں سے یعنی کانوں سے۔

<u>مومن میں روحُ القدس کی تخلیق:</u>

اب میں اصل مطلب کی بات یہ کروں گا کہ جب آپ کو دین اور ایمان کی باتوں سے خوشی محسوس ہوتی ہے، تو یہ ثبوت ہے کہ آپ کے اندر روحُ القدس کی تخلیق ہوتی ہے۔ روحُ القدس جو بڑے معجزات والی روح ہے، جو انسانِ کامل کی روح ہے، بلکہ یہ انسانِ کامل کا نور ہے، اُس کی تکمیل ہوتی ہے۔ ایک بات مجھے خوب یاد آئی کہ آپ جب یہ کہتے ہیں کہ ہم امام کو پہچانتے ہیں، پیغمبر کو یا خدا کو یا خود کو، تو اِس قسم کی پہچان والی روح کس طرح آتی ہے؟ یا یوں کہنا چاہیے کہ آپ امام کے نور کی شناخت حاصل کرتے ہیں تو مجھے بتائیے کہ پہلے امام کا نور آپ کے اندر آتا ہے یا کہ پہلے شناخت ہوتی ہے۔

پہلے شناخت نہیں ہوتی ہے، پہلے امام کی روح کہیں یا امام کا نور آپ میں منتقل ہو جاتا ہے اور وہ نور ویسے ہی معجزے سے جادو سے نہیں آتا کہ امام نے کہا کہ جاؤ میری روح! فلان مرید میں، فلان فرد میں یا میرے فلان مومن میں، میری روحانی اولاد میں تو وہ روح آ گئی، اِس طرح سے نہیں ہوتا ہے۔ اُس کے لئے اصول ہے، آپ علم اور معرفت کے ذریعے سے امام کی روح کو اپنا سکتے ہیں اور اُسی روح کے اندر آپ امام کی شناخت حاصل کر سکتے ہیں، جس کو آپ نے بنائی تھی۔ اپنے اندر آپ نے امام کی ایک اضافی روح کی تخلیق کی تھی، اِن کوششوں سے جو حصولِ علم کے لئے آپ کرتے ہیں۔ تو روحانی غذا کی بات ہے اور یہ بات ہے کہ وہ روحانی غذا یہاں سے آتی ہے یعنی کان سے اور اِس میں یہ بات ہے کہ خوشی کیوں ہوتی ہے؟ میں نے کہا کہ خوشی اُس صورت میں ہوتی ہے کہ آپ کے اندر کوئی تخلیق ہوتی ہے، کوئی روح بنتی ہے، اگر بات جسمانی ہے تو نفس حیوانی بنتی ہے اور بات روحانی ہے تو ہمارے اندر روحُ الایمان یا کہ روح قدسی کی تخلیق ہوتی ہے۔

درمیان میں ایک اور مثال آپ کو پیش کروں، ایک بیمار انسان جب غذا کھاتا ہے تو اُس کو کوئی خوشی نہیں ہوتی ہے یہ کیوں؟ یا اُس کو مزہ نہیں آتا ہے، اوّل تو وہ خوراک کھاتا نہیں ہے، اور اگر کھاتا ہے تو لذت محسوس نہیں ہوتی ہے، خوشی محسوس نہیں ہوتی ہے، یہ کیوں ایسا ہے؟ وجہ اِس کی یہ ہے کہ وہ اِس Position میں نہیں ہے کہ اُس کے اندر نفس بنے، روح بنے وہ اِس Position میں نہیں ہے، جب وہ اُس غذا کو نہیں چاہتا ہے تو یہ اشارہ ہے کہ اُس کا

وجود اُس کو بتاتا ہے کہ مجھے ضرورت نہیں ہے، میں اِس Positionمیں نہیں ہوں کہ میرے اندر طاقت آئے Energy بنے اور نفس حیوانی بنے وہ کیفیت نہیں ہے، اِس واسطے بس نہ کھاؤ تو ٹھیک ہے، اُس کی طبیعت اُس کو بتاتی ہے، اُس کا اشتہا اُس کو بتاتا ہے اور اگر وہ بالجبر کھاتا ہے تو مزہ اُس کو نہیں آتا ہے، لذت محسوس نہیں ہوتی ہے یہ اِس بات کی علامت ہے کہ اُس کے اندر کوئی بھی روح نہیں بنتی ہے۔

آپ نے سمجھ لیا اسی طرح جس فرد کو روحانی باتوں سے مزہ نہیں آتا ہے تو یہ اِس بات کی علامت ہے کہ اُس کے اندر وہ روح نہیں بنتی ہے، کونسی روح؟ روحُ الایمان، کونسی روح؟ روحُ القدس، کوئی وجہ ہے، یہ باتیں وہ قبول نہیں کر رہا ہے۔ اُس کے اندر کوئی خرابی ہے وہ روحانی مریض ہے، اُس کے ندر کوئی بیماری ہے، جس کا علاج ہونا چاہیے یا شک ہے شبہہ ہے یا وہ دین کے کسی خاص مقام پر نہیں ہے، اِس Positionمیں نہیں ہے کہ اُس کی تخلیق ہو جائے تعمیر ہو جائے، تعمیر نہیں ہو رہی ہے، تخلیق نہیں ہو رہی ہے۔

اِس کے برعکس جن کو دینی باتوں سے بہت زیادہ دلچسپی ہے، تو انہیں اپنے آپ کو مبارکباد دینی چاہیے کیونکہ اُن کے اندر مانگ ہے Demand ہے، اُن کا جو روحانی اشتہا ہے بڑا صاف ہے، اُن کو غذا چاہیے، اُن کو بھوک لگ رہی ہے اور بھوک اِس بات کی علامت ہے کہ وہ صحت مند، تندرست ہیں۔ اِس بات کی علامت ہے کہ اُن کی تخلیق ہو رہی ہے، اُن کا جسم بڑھ رہا ہے اور اشتہا کا نہ ہونا جو ہے وہ کوئی اچھی علامت نہیں ہے۔

اچھا! تو اسی طرح میں مطالعہ کی بات کرتا تھا، جب مطالعہ میں آپ کو خوشی محسوس ہو گی تو آپ خود کو مبارکباد کہیں کہ آپ کو وہ غذا مہیا ہو رہی ہے، آپ کے اندر تعمیر ہو رہی ہے، تخلیق ہو رہی ہے، روح القدس کی، روح الایمان کی اور عقل والی روح کی آپ کے اندر تخلیق ہو رہی ہے۔ ہاں! ایک چیز ہے کہ جسمانی خوراک اور روحانی خوراک میں ایک فرق ہے وہ یہ کہ جسمانی خوراک یہ ہے کہ ہم ایک حد تک خوراک کھا سکتے ہیں، پھر اُس کے بعد ہمارے اندر معدہ ایسا ہے کہ اُس میں گنجائش نہیں ہے اور ہمارا جو ہاضمہ ہے وہ ایسا ہے کہ وہ محدود کام کر سکتا ہے۔ ضرورت سے زیادہ غذا حاصل کرنے سے تکلیف ہو جاتی ہے۔ اِس کے برعکس روحانی غذا ایسی نہیں ہے، وہ تو ہر وقت زیادہ سے زیادہ ہونی چاہیے اور جس قدر زیادہ کھائیں اُس قدر زیادہ راحت ہو گی، اُس قدر ہم میں طاقت آئے گی۔

ایک اور چیز یہ ہے کہ آپ نے اِس تذکرے میں توجہ دی ہو گی کہ روحیں جو ہیں وہ ایک کے اوپر ایک ہیں اور اعلیٰ سے اعلیٰ ہیں اور ادنی سے ادنی ہیں۔ تو جیسے جیسے ہم اُوپر کو جائینگے ہماری لذت میں اِس قدر اضافہ ہو جائے گا یعنی کہنا یہ ہے کہ ہم کو جسمانی غذا کی نسبت، روحانی غذا میں زیادہ لذت محسوس ہو گی اور اِس کائنات کے اندر جو جانور ہیں اُن پر ذرا تبصرہ کریں۔ دنیا کے اندر بہت سے جانور ہیں جسمانی غذا وہ بھی ہماری طرح کھاتے ہیں لیکن اُن کو اتنی خوشی نہیں

ہے اُن جسمانی غذاؤں سے جتنی کہ ہم کو ہے۔ مثلاً جو جانور گوشت خور ہیں گوشت کو ایسے ہی کھاتے ہیں اور کُچھ پرندے پھل کھاتے ہیں یا دانہ کھاتے ہیں۔ اُن کو اتنی لذت نہیں ہے، جتنی کہ انسان کو کسی چیز کے چبانے، چوسنے اور اچھی طرح سے کھانے سے محسوس ہوتی ہے۔ یہ فرق کیوں ہے؟ غذا تو وہی ہے، جسم کی ضرورت بھی وہی ہے لیکن فرق کیوں ہے؟

یہ فرق بھی اسی لئے ہے کہ ہم میں کُچھ ایسی روحیں ہیں جو اُن سے بڑھ کر ہیں، اِن اعلیٰ روحوں کی وجہ سے ہم کو وہ لذتیں بھی زیادہ محسوس ہوتی ہیں جو ہم میں اور حیوانوں میں مشترک ہیں۔ بہرحال یہ کہنا ہے کہ جو روح الایمان ہے وہ اُوپر کی روح ہے، جو روح القدس ہے وہ تو سب سے اُوپر ہے، اُس روح کی لذتیں اور اُس کی غذائیں اعلیٰ سے اعلیٰ ہیں اور اُس کی غذائیں علم کی باتیں ہیں، معرفت ہے اور حکمت کی باتیں ہیں اور خدا کے بھید ہیں اور اِن بھیدوں کے جاننے سے انسان کو ابدی نجات ملتی ہے۔

<u>خدا کے بھید صرف خواص کے لئے ہیں:</u>

خداوندِ عالم نے یہ اُصول کیوں اختیار کیا ہے کہ اُس نے اپنے کلام کے اندر بہت سے بھید رکھے ہیں اور اِس طرح سے رکھے ہیں کہ عوام کی رسائی اُن بھیدوں تک نہیں ہو رہی ہے، اِس کا مقصد کیا ہے؟ آخر کوئی مقصد ہے، وہ مقصد یہ ہے کہ خدا نہیں چاہتا ہے کہ خدا کے بھید سب میں مشترک ہوں، خدا تو یہ چاہتا ہے کہ جو خواص ہیں اُن کو ملیں۔ جو عوام ہیں وہ اُن تک نہ پہنچ سکیں، خدا نے جو کلام نازل کیا ہے، جو قرآن بھیجا ہے اُس کا اندازِ بیان کُچھ اِس طرح سے ہے کہ بھید تو ہر وقت بھید ہی رہتے ہیں اور اُن بھیدوں تک عوام کی رسائی نہیں ہو رہی ہے۔ یہ خواص پر خصوصی مہربانی ہے، اِس میں خدا کا منشاء یہ ہے کہ جو حقیقی مومنین ہیں اُن کو پتہ ہو، اُن کو خبر ہو، اُن پر ظاہر ہو، دیکھا آپ نے کہ خدا کا مقصد کیا ہے۔ جب معلوم ہُوا کہ خدا کا مقصد یہی ہے کہ ہم بھیدوں میں دوسروں سے آگے بڑھیں اور بھیدوں سے، اسرار سے باخبر ہو جائیں اور کسی بھی دین کے بھید سے باخبر ہونے سے ہم کو بہت سی خوشی ہوگی، یہ خوشی اِس بات کی علامت ہے کہ اُس وقت ہماری روح بہت Powerful ہو جاتی ہے، بہت طاقت حاصل کرتی ہے اُس بھید سے، بھید ایک طرح سے ہمارا سرمایہ ہے، ایک گوہرِ نایاب ہے۔

دنیا کے اندر جو قیمتی اشیاء ہیں وہ نایاب ہیں وہ پوشیدہ ہیں، جو قیمتی چیزیں ہیں وہ حکومت کے خزانے میں پوشیدہ ہیں یا کسی تونگر کے Treasury میں پوشیدہ ہیں یا کسی Box میں پوشیدہ ہیں یا کسی کان میں اور پہاڑ میں پوشیدہ ہیں یا سمندر کی گہرائی میں پوشیدہ ہیں، قیمتی چیزیں بکھری ہوئی نہیں ہیں۔ اسی طرح دین کے اندر جو حقیقی باتیں ہیں وہ بہت ہی پوشیدہ ہیں، آپ یہ کہیں گے کہ اب تک جو دین پر کام کیا ہے، اِس کے نتیجے میں ہمارے پیروں نے، بزرگوں نے

اور اماموں نے علم کے، حکمت کے اور بھیدوں کے جواہرات بکھیر دئے ہیں، صحیح ہے یہ حقیقت ہے۔ لیکن آپ کو معلوم ہے کونسا علم زیادہ ضروری ہے؟ جس علم کا تعلق زیادہ سے زیادہ ماضی سے ہے یا جس علم کا زیادہ سے زیادہ تعلق حال اور مستقبل سے۔

میں تو یہ کہوں گا کہ ہمارے پیروں نے، بزرگوں نے اپنے زمانے کے مطابق جن باتوں کی زیادہ سے زیادہ اہمیت تھی اُن کی طرف زیادہ توجہ دی اور امام نے اُن کو وہ باتیں بتائیں اور ہاں اِس سے کوئی انکار نہیں ہے کہ ایسی باتیں بھی ہیں جو حال اور مستقبل میں بھی ہمارے لئے مفید ثابت ہوسکتی ہیں، اِس کے باوجود ہم یہ نہیں کہہ سکتے ہیں کہ علم کا خزانہ اُسی وقت ختم ہوگیا۔ علم کی زیادہ سے زیادہ اہم باتیں ہم کو اِسی زمانے میں بھی مل سکتی ہیں، اپنے وقت سے متعلق علم کی باتیں یا تو ہم براہِ راست امام سے حاصل کرسکتے ہیں یا امام اپنے ارشادات میں ہم کو بتا سکتے ہیں یا کسی بھی وسیلے سے ہم اُن باتوں کو جن کی اِس وقت ضرورت ہے، اسی وقت اسی زمانے میں حاصل کرسکتے ہیں۔

دیکھا آپ نے کہ علم کبھی ختم نہیں ہوتا ہے اور بھید ختم نہیں ہوتے ہیں اگر ہم کو ایسے بھید ملیں جن کی اب اور اِس وقت ضرورت ہے تو ہم کس قدر خوش نصیب قرار پائیں گے، ہم بڑے خوش نصیب ہوں گے، ہمارے زمانے کے مسائل حل ہو جائیں گے، ہمارے اپنے وقت سے متعلق علم کی باتیں بتا دی جائیں تو ہم بڑے خوش نصیب ہو جائیں گے۔ اِس کے لئے علم کی طرف توجہ کی ضرورت ہے اور اِس کے لئے میں نے کہا کہ آپ براہِ راست امام سے رابطہ قائم کرسکتے ہیں، لیکن تھوڑی محنت کرنی ہوگی، بلکہ کافی محنت کرنی پڑے گی۔

<u>علم اسماعیلیوں کی میراث ہے:</u>

علم ہماری یعنی اسماعیلیوں کی میراث ہے، چونکہ ہم راہِ مستقیم پر جارہے ہیں یعنی اُسی رستے سے جارہے ہیں جس پر سے انبیاء اور اولیاء خدا تک پہنچے تھے، وہی راستہ ہمارا بھی ہے۔ جب ہم انبیاء اور اولیاء کے رستے پر جارہے ہیں تو ہم کو وہی علم ملنا چاہیے جو پیغمبروں کو اور اماموں کو دیا گیا تھا اور یہ علم ہادیٔ برحق کے وسیلے سے ہم کو ملے گا اور ملتا رہے گا، یقیناً ملے گا۔

اِس کے لئے جس حد تک ظاہر میں ہم پر کوشش واجب ہے ظاہری علم کی ضرورت ہے، علم الیقین کی ضرورت ہے، جب ہم اُس ضرورت کو پوری کریں گے تو اُس کے بعد ہم کو عین الیقین کا علم دے دیا جائیگا۔ اِس کے لئے ہر اسماعیلی یہ کوشش کرے کہ علم میں ترقی کرے، بہت ہی ممکن ہے، لیکن جانفشانی کے بغیر، جدوجہد کے بغیر کوئی بھی کام انجام نہیں پاسکتا، اِس کے لئے بیشک قربانی کی ضرورت ہے، وقت کی قربانی اور محنت کی قربانی پھر

یقین اور بھروسہ ہونا چاہیے۔ امامؑ پر بھروسہ کیا جائے۔ آپ کو علمِ لدّنی یعنی غیب کا علم نہیں دیا جائے گا جب تک کہ آپ علمِ ظاہر سے فائدہ نہیں اٹھاتے ہیں، آپ کا ظاہر سے باطن کی طرف راستہ ہے، ظاہری علم سے آپ کو ایک پُل باندھنا پڑے گا، پھر اُس کے بعد آپ باطن کے دروازے تک جاسکتے ہیں اور پھر آپ پر بے دریغ امام علم کے خزانے کھول سکتے ہیں، اِس کے لئے آپ زیادہ سے زیادہ صداقت سے اور حقیقی محبت سے علم کے رستے میں آگے بڑھیں اور علم میں ترقی کریں۔

ہاں! ایک بات یہ ہے کہ شکوک وشبہات بھی علم سے دُور ہو جائیں گے، آپ باور نہیں کریں گے کہ آپ میں کوئی شک وشبہہ ہے، لیکن شکوک وشبہات ہوتے ہیں، پوشیدہ پوشیدہ ہوتے ہیں، جس طرح جسم میں خون پوشیدہ چُھپا ہُوا ہے۔ اسی طرح دینی باتوں کے اندر اِدھر اُدھر شکوک وشبہات ہوتے ہیں وہ شکوک وشبہات اہلِ ظاہر سے اور دنیا والوں سے ہم میں پیدا ہوتے ہیں، تو اُن شکوک وشبہات کا ازالہ بھی اِسی دینی علم سے ہو جاتا ہے اور ہمارے دوسرے سوالات بھی خود بخود حل ہو جاتے ہیں یعنی علم ایک نور ہے جس کی روشنی میں ہم بہت آگے چل سکتے ہیں اور علم سے بڑھ کر کوئی سعادت نہیں ہے۔

قرآن کے اندر جو جو فضیلتیں بیان کی گئی ہیں آپ کو عجیب لگے گا، خدا کی یہ حکمت کہ قرآن کے اندر تقویٰ کا پرہیزگاری کا ذکر ہے، بہت بڑھ چڑھ کر تقویٰ کا ذکر ہے، لیکن جا کر ایک آیت کے اندر خداوندِ عالم نے تقویٰ کو علم سے ملایا ہے، علم کے بغیر تقویٰ نہیں ہے إِنَّمَا يَخْشَى اللهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ (۳۵:۲۸) ترجمہ: اللہ کے بندوں میں سے صرف علم رکھنے والے لوگ ہی اس سے ڈرتے ہیں۔ خوفِ خدا وہی صحیح ہے جو عقل و دانش کے ساتھ ہو یا پرہیزگاری وہی دُرست ہے جو علم کے ساتھ ہو۔ یہاں پر تقویٰ کی تعریف کر کے اِس تقویٰ کو علم کے ساتھ خداوندِ عالم نے ملایا، تو علم کی شرط تقویٰ اور تقویٰ کی شرط علم رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً وَعِلْماً (۴۰:۷) یہ فرشتوں کی زبانی ہے جو قرآن میں دعائیہ انداز میں کہا گیا ہے جو فرشتے کہتے ہیں کہ خداوندا تو نے ہر چیز کو رحمت اور علم میں سمویا ہے یعنی اِس کائنات کے دو خول ہیں، اِس کائنات کے اور ہر چیز کے دو خول ہیں۔ اندر والا خول رحمت کا ہے اُس کے باہر والا جو بڑا ہے وہ خول علم کا ہے، اِس Universe کا، اِس کائنات کا ایک خول رحمت کا ہے اور اِس کے اُوپر کا خول علم کا ہے۔

خدا کی کُرسی رحمت کی ہے خدا کا تخت علم کا ہے، خدا کسی مادّی تخت پر جلوہ نما نہیں ہے، خدا علم ومعرفت کے تخت پر ہے۔ اگر آپ اپنے اندر دینی شناخت اور علم ومعرفت کا ایک تخت مہیا نہیں کریں گے تو خدا کے جلوہ نما ہونے، جلوہ فگن ہونے کی توقع نہیں ہے، دین کے اندر حقیقی محبت کی بڑی اہمیت ہے، لیکن یہ محبت رستے کو ہموار کرنے کے لئے ہے، اخلاق کی اصلاح کے لئے ہے، محبت بذاتِ خود کوئی مقصود نہیں ہے۔ محبت وابستگی ہے امامؑ سے تاکہ اِس وابستگی

کے نتیجے میں علم حاصل ہو، محبت ایک پُل ہے، محبت ایک Shortcut ہے خدا تک جانے کے لئے، علم مقصدِ اعلیٰ ہے۔ علم مقصدِ اعلیٰ نہ ہوتا تو خدا نہ فرماتا کہ کائنات کا سب سے بیرونی خول علم کا ہے تو اِس علم کے خول نے کائنات کو اپنی گرفت میں لیا ہے اور دُوسرے الفاظ میں سب سے اوپر عقلِ کُلی ہے جو علم کا سرچشمہ ہے اور اُس کے نیچے نفس کُلی ہے جو رحمت کا سرچشمہ ہے، اسی معنی میں کہا گیا تھا کہ رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً وَعِلْماً (۴۰:۷) خداوندا تو نے ہر چیز کو نفس کُلی میں سمویا ہے اور نفس کُلی کو عقلِ کُلی میں سمویا ہے تو سب سے بیرونی خول عقلِ کُلی کا ہے اُس کے اندر کا خول نفس کُلی کا ہے وہ علم کا سرچشمہ ہے اور یہ رحمت کا۔

ٹائپ: اکبر علی پروف: نسرین اکبر

استادِ بزرگوار علّامہ نصیر الدّین نصیرؔ ہونزائی

کا پُرحکمت بیان

عنوان: امام نورِ قرآن ہے

Click here for Audio

کیسٹ نمبر: ۵ تاریخ: ۱۹۷۷، کراچی

میرے خیال میں قرآنی علم کے لحاظ سے بہت اہمیت والی باتیں ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ باتیں ہمارے عزیزوں کے لئے بہت ہی مفید ثابت ہوسکتی ہیں اور وہ بھی اپنے امامِ برحق مولانا مرتضیٰ علیؑ کے ایک ارشاد کی روشنی میں اور وہ ارشاد یہ ہے جو مولا علیؑ نے فرمایا ہے، قرآن چار چوتھائیوں میں نازل ہوا ہے یعنی ایک اعتبار سے، ایک لحاظ سے قرآن کے چار حصّے ہیں۔

اُن میں سے ایک حصّہ وہ ہے، جس کو قرآن کی چوتھائی کہنا چاہئے کہ اُس میں عیان طور پر، نمایاں طریقے سے مولانا علیؑ کے بارے میں آیات ہیں، یعنی قرآن کے چار حصّوں میں سے ایک حصّے میں ایسی آیتیں ہیں جن کے متعلّق مفسّرین نے مان لیا ہے کہ یہ آیات امامِ عالی مقام مولانا علیؑ کی شان میں ہیں۔ تو قرآن کے ایک چوتھائی میں ایسی آیتیں ہیں اور وہ کون کون سی آیتیں ہیں، کس قسم کی آیتیں ہیں اُنکے جاننے کے لئے عالم شیعیت کی کُتب سے اور تفاسیر سے پتہ چل سکتا ہے کہ کون کون سی آیتیں نمایاں طریقے سے مولا علیؑ کی شان میں نازل ہوئی ہیں اس کا پتہ چل سکتا ہے۔ اب قرآن کے اِس حصّے کے بارے میں اِس سے زیادہ تفصیل میں نہیں جائیں گے۔

دوسرا حصّہ قرآن کا وہ ہے جس میں کہ مولا علیؑ کے دشمنوں کا ذکر ہے۔ اِس مقام پر ہمیں ذرا سوچنا چاہئے کہ یہ کسطرح ممکن ہے، حالانکہ آپ عزیزوں میں سے تقریباً سب نے قرآن کو عبارت سے اور ترجمہ سے پڑھا ہے اُن کو اب تک اِس بات کا پتہ نہیں چلا ہے کہ قرآن میں کہیں کوئی ایسی آیت ہو جسمیں فرمایا گیا ہو کہ علیؑ کے دشمن ایسے ہیں، علیؑ کے دشمن ویسے ہیں۔ ظاہر میں ایسی کوئی بات نہیں ہے لیکن جب مولا نے فرمایا تو ہم پر واجب ہوا کہ اس مطلب کو سمجھیں۔

وہ اِس طرح سے ہے کہ رسول اللہؐ نے ایک حدیث فرمائی تھی اور وہ حدیث یہ ہے: اللّٰھُمَّ وَالِ من وَالاہُ وَعَادِ مَن عَاداہُ۔ ترجمہ: اے بارِخدایا جو علیؑ سے دوستی رکھے اُس کے ساتھ تو بھی دوستی رکھنا اور جو علیؑ سے دشمنی کرے تو بھی اُس سے دشمنی کرنا (مشکوٰۃ المصابیح، حصۂ چہارم، حدیث نمبر ۵۴۸)۔ آپ جانتے ہیں کہ رسولؐ جس بات کے لئے دعا فرماتے ہیں وہ بات ایک واقعی حقیقت کی صورت میں موجود ہوتی ہے یعنی اگر رسولؐ کسی مطلب کے لئے دعا کرتے ہیں تو وہ مطلب دعا سے پہلے ہی حاصل ہوا ہوتا ہے۔ خواہ وہ مطلب بعد میں حاصل ہو یا پہلے لیکن رسولؐ جس چیز کے لئے دعا کریں گے وہ ایک امکانی حقیقت ہوگی۔

اب اِس حدیث کی روشنی میں آپ غور کریں کہ واقعۃً خدا نے اُن تمام لوگوں سے دشمنی کی ہے جن لوگوں نے امامؑ سے دشمنی کی تھی تو اِس کا مطلب یہ ہوا کہ خدا کے ذاتی دشمن نہیں ہیں اور ہو نگے بھی کیسے وہ تو خدا ہی ہے۔ دشمنی اور دوستی دونوں کسی برابر والے سے ہو سکتی ہے اور خدا مخلوق سے بہت بلند و بالا ہے اس لئے وہ کسطرح کسی مخلوق سے حقیقی دشمنی کرتا ہے۔

اگر خدا کی کسی سے دشمنی ہے تو یہ نسبتی دشمنی ہے یعنی یہ منسوب ہے اور کسی اور کی نسبت سے ہے دشمنی اور دوستی بھی۔ وہ یہ کہ اِس دنیا کے اندر جو زمانے کے پیغمبر سے دشمنی کرے گا خدا اُس سے دشمنی کرے گا، چونکہ رسول خدا کا نمائندہ ہے اور خدا کا خلیفہ ہے اور اسی طرح جو لوگ امامؑ سے دشمنی کریں گے خدا اُن لوگوں سے دشمنی کرے گا اور اُن کو اپنا دشمن قرار دے گا۔ اُنکا نام ابلیس ہوگا کسی زمانے کی مثال میں ہامان ہوگا، فرعون ہوگا یا یوں کہنا چاہیے دوسرے الفاظ میں کہ وہ زمانے کے فرعون ہوں گے، وہ زمانے کے ابلیس ہوں گے، وہ زمانے کے شیطان ہوں گے، وہ زمانے کے قارون ہوں گے اور وہ زمانے کے شداد ہوں گے وغیرہ، وغیرہ۔ جس طرح کہ اگلے زمانوں میں خدا کی نظر میں جو لوگ کافر قرار پائے تھے اور جو لوگ خدا کے دشمن کہلائے تھے اُس کی اصل وجہ خدا کی ذات کی طرف نہیں تھی۔

اُسکی اصل وجہ یہ تھی کہ اُن منکرین نے رسولؐ سے انکار کیا تھا اور زمانے کے امامؑ سے انکار کیا تھا۔ ابھی میں سمجھتا ہوں کہ اِس مطلب کی کُچھ وضاحت ہوگئی جو مولا علیؑ نے فرمایا ہے کہ قرآن کا ایک حصّہ ہمارے دشمنوں کی شان میں ہے، ہمارے دشمنوں کے بارے میں ہے تو کچھ اِس انداز سے امامؑ کے دشمنوں کے بارے میں ہے یعنی یہ کہ جہاں کافروں کا ذکر ہے، جہاں منافقوں کا ذکر ہے، جہاں انکار کرنے والوں کا، نافرمانوں کا ذکر ہے یہ سب لوگ امامؑ ہی کے نافرمان ہیں اور امامؑ ہی سے کافر ہیں۔

<u>اب تیسرا حصّہ! تو تیسرے حصّہ کے بارے میں امامؑ نے فرمایا کہ قرآن کا تیسرا حصّہ جو ہے وہ تذکروں پر مشتمل ہے، قصّوں پر مبنی ہے</u>۔ یعنی قرآن کے تیسرے حصّے میں قصّے ہیں انبیاء علیھم السّلام کے اور دوسرے لوگوں کے، تو اُن قصّوں کے بارے میں بھی جب آپ سوچیں گے تو اسمیں بھی، اُس حصّے میں بھی امامؑ ہی کا ذکر ہوگا۔ کیونکہ جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ امامؑ تمام انبیاء علیھم السّلام کے ساتھ تھے اور مخفی طریقے سے وہ کام کرتے تھے۔ پیغمبروں کے وزیر کی حیثیت سے اور دوسری حیثیتوں میں امامؑ کام کرتے تھے۔ لہٰذا اُن قصّوں میں بھی امامؑ ہی کا ذکر ہے، تاویل کی حیثیت میں بھی اور ظاہر میں بھی۔

<u>اب آخری حصّۂ قرآن جو ہے وہ فرائض کی صورت میں ہے، اُس میں اوامر ہیں اور نواہی ہیں</u>، یعنی اُس میں ارشادات ہیں کرنے اور نہ کرنے کے سلسلے میں تو اِس مطلب کو آپ آسانی سے سمجھ سکتے ہیں کہ امامؑ اولولامر ہیں، ولیٔ امر ہیں اور امر کے مالک ہیں اور خدا و رسولؐ نے دین اور ایمان کا امر اور اِذن امامؑ کے حوالے کر دیا ہے، لہٰذا اگر کوئی امر ہے تو وہ امامؑ کے تحت ہے، امامؑ کے وسیلے سے ہے، امامؑ کے ذریعے سے ہے۔ اگر کوئی نہیں ہے ممانعت کی چیز، تو وہ وہ بھی امامؑ کے وسیلے سے ہے کیونکہ نہیں بھی اور امر بھی دونوں صاحبِ امر کے وسیلے سے ہوتے ہیں لہٰذا قرآن کا یہ حصّہ بھی امامؑ کے تحت آتا ہے اور اس میں بھی Indirectly امامؑ ہی کا تذکرہ ہے۔ پس معلوم ہوا کہ قرآن کے اگر چار حصّے ہیں تو اُن میں سے کوئی حصّہ امامؑ کے تذکرے سے خالی نہیں۔ تو ہم دعویٰ کر سکتے ہیں [کہ]

قرآن کی کوئی آیت ظاہر میں یا باطن میں امامؑ کے ذکر سے، امامؑ کی تعریف وتوصیف سے خالی نہیں۔

اب میں ایک خاص بات اِس مقام پر بتاتا ہوں کہ یہ جو میں نے آپ سے عرض کیا عربی قول میں ہے، مختصراً میں اُس مقالے کا حوالہ بھی آپ کو دے سکتا ہوں اور کتابوں کا بھی حوالہ دے سکتا ہوں کہ کس کتاب میں یہ قول ہے جو امامؑ نے فرمایا ہے۔ وہ مناقبِ مرتضوی یا کوکب دِرّی اور علیؑ کی تعریف وتوصیف پر مشتمل جتنی کتابیں ہیں اُن میں سے بعض میں یہ قول آیا ہے کہ مولا علیؑ نے ایک ایسا ارشاد فرمایا ہے جس میں یہی بیان ہے جو میں نے آپ سے کہا کہ: ''نزل قرآن أرباعاً، فربعٌ فینا، وربعٌ فی عدوِّنا، وربعٌ سِیَر وّامثال، وربعٌ فرائض وّ أحکام، ولنا کرائم القرآن۔ قرآن نازل ہوا ہے چار حصوں میں بس ان میں سے ایک چوتھائی ہماری شان میں ہے اور ایک چوتھائی ہمارے دشمنوں کے بارے میں ہے اور ایک چوتھائی قصے پر اور ایک چوتھائی اوامر ونواہی پر'' (کتاب: شرح الاخبار، جلد ۹، علیؑ فی القرآن، ص ۳۵۳) تو جو چوتھائی [حصہ] امام کے دشمنوں پر مشتمل ہے وہ بھی Indirectly امام کے تذکرے پر مشتمل ہے اور قصے بھی اور اوامر ونواہی بھی۔

آخر میں ایک خاص بات بتانا چاہتا تھا وہ یہ ہے کہ اس قول کے آخر میں امامؑ نے فرمایا کہ: ولنا کرائم القرآن قرآن کی بزرگ ترین آیتیں ہماری شان میں ہیں۔ ہمارا اصل مضمون یہ ہے۔ میں اس پر گفتگو کرنا چاہتا ہوں کہ اس کا کیا مطلب ہے جو امام نے فرمایا کہ ولنا کرائم القرآن آپ اب یا بعد میں اِس جملہ کو نوٹ بھی کرلیں ولنا کرائم القرآن کہ قرآن کی بزرگ ترین آیتیں ہماری شان میں ہیں۔ اس سے ہم کو عجیب قسم کا تصوّر ملتا ہے اور وہ یہ کہ پتہ چلتا ہے کہ قرآن کے اندر بڑی سے بڑی آیتیں بھی ہیں اور چھوٹی سے چھوٹی آیتیں بھی ہیں۔ اب سنئے کہ ہم اِن بڑی آیتوں کے بارے میں کیا کہنا چاہتے ہیں۔ بہت اچھا تصور ہے۔ ہم اِن بڑی سے بڑی آیتیں جو امامؑ کی شان میں ہیں روشنی کے مینارے بنائیں گے اور اِس قرآن کو ایک دنیا قرار دیں گے یا کم سے کم قرآن کو ایک شہر سمجھیں گے۔ قرآن کا تصور ایک شہر کی طرح (Like a City) کریں گے اور اُن کے اندر جو بڑی سے بڑی آیتیں جو امام کی شان میں ہیں اُن کو روشنی کے مینار قرار دینگے، کیا! روشنی کے مینار Lighthouses۔ اب اِن میناروں میں سے ہر ایک کی چوٹی پر امام کی معرفت کی Light بلب سجائیں گے اور پھر امام کے علم اور امام کی معرفت سے قرآن کا شہر جگمگ جگمگ ہو جائے گا اور قرآن کے شہر کی ہر چیز امام کے نور کی روشنی میں نظر آنے لگے گی اور بہت ہی رنگین اور پُر رونق ہو گی۔ یہ ہوا ایک بہترین تصور ظاہری علم کی صورت میں کہ کس طرح امام قرآن کا نور ہے۔ امام کس طرح قرآن کا نور ہے اس کی دو مثالیں ہیں ایک تو Practical ہے۔ آپ جب روحانیت میں جائیں گے تو وہاں پر ایک روحانیت کی دنیا آپ کے سامنے آئے گی۔ وہ قرآن ہی کی دنیا ہو گی اور اس میں Light ہو گی اور وہ Light امام کا نور ہو گا تو وہاں پر قرآن کی دنیا کی ہر چیز، روحانیت کی دنیا کی ہر چیز آپ امام کے نور کی روشنی میں پائیں گے۔ اِس معنی میں صحیح ہے جو خدا نے فرمایا تھا کہ میں نے جہاں کتاب بھیجی ہے وہاں نور بھی بھیجا ہے [قَدْ جَاءَكُم مِّنَ اللَّهِ نُورٌ وَكِتَابٌ مُّبِينٌ (۵/۱۵)]۔ یہ تو Practical ہو گیا کہ آپ نے روحانی طور پر دو چیزیں دیکھیں۔ ایک دنیائے روحانیت دیکھی جو قرآن ہے،

واقعات ومعجزات وامثال ایسی بہت ساری چیزوں کی ایک دنیایاایک شہر،ایک کائنات اور دوسری چیزآپ نے روشنی دیکھی جو امام کی روشنی تھی ۔اسی طرح اب اِس وقت جو میں قصہ بیان کر رہا تھا جو مثال پیش کر رہا تھااور جوتصور آپ کے سانے پیش کر رہا تھا میرے خیال میں یہ آپ کے لئے ایک جدید چیز ہے ہم چاہتے ہیں کہ آپ کو جدید ترین چیزیں ملیں اور بہت منظم طریقے سے آپ کے سامنے چیزیں ملیں ۔تو میں نے کہا کہ جن آیتوں کے بارے میں امام نے فرمایا ہے کہ قرآن کی عظیم ترین آیتیں ہماری شان میں ہیں تو جو عظیم ترین آیتیں امام کی شان میں ہیں اُن کو ہم نے Lighthouses بنایا یعنی روشنی کے مینار بنائے اوران پر علم ومعرفت کے بلب لگائے تو بھر ان بلبوں کی روشنی میں دنیائے قرآن جگمگ جگمگ ہونے لگی اور دنیائے قرآن امام کے نور میں مستغرق ہوگئی،ڈوب گئی،جس طرح سورج کی روشنی میں یہ کائنات ہر وقت ڈوبی رہتی ہے اور پوری کائنات ڈوبی رہتی ہے اور دن کے وقت ہم محسوس کرتے ہیں کہ کس طرح دُنیا سورج کی کرنوں میں اور سورج کی روشنی میں ڈوبی رہتی ہے ۔اسی طرح اُن آیتوں کی روشنی میں جو بزرگ ترین آیتیں ہیں، بڑی بڑی آیتیں ہیں اُن کی روشنی میں قرآن کی دُنیا،[اسے] عالمِ قرآن کہیے یا کہ دنیائے قرآن کہیے یا قرآن کا شہر کہیے وہ امام کی معرفت اور امام کے علم میں ڈوبا ہوا ہے۔

آپ کے سامنے وضاحت ہوئی کہ دوطرح سے ہم اِس کو سمجھتے ہیں کہ امام کس طرح قرآن کا نور ہے First Stage پر جیسا کہ ابھی بات ہورہی ہے کہ امام کی شان میں جتنی بڑی بڑی آیتیں ہیں اُن کے ترجموں کو آپ سمجھ لیں،ان کی کُچھ حکمت کو سمجھ لیں تو پھر اُس کی روشنی میں آپ پورے قرآن کو سمجھ لیں گے ۔تو میں نے شروع میں کہا تھا کہ میں کُچھ ایسی مفید باتیں بتاؤں گا جو آپ کو قرآنی علم کے حصول کے سلسلے میں ممد ومعاون ثابت ہوجائیں ۔تو یہی میرا دعویٰ ہے اور یہی میرا کہنا کہ آپ اگر قرآن کی اُن عظیم ترین آیتوں کو سمجھیں گے تو پورے قرآن کو سمجھیں گے اور ظاہری طور پر بھی کسی بھی چیز کو سمجھنے کے لئے کئی طریقے ہوتے ہیں اور اس میں ایک مختصر طریقہ یہ ہوتا ہے کہ اگر آپ کو وقت نہیں ہے کہ کسی چیز کو تفصیل سے سمجھیں تو آپ اس کا مختصر جائزہ لیتے ہیں تو مختصر جائزہ لینے کا بھی کوئی طریقہ ہوتا ہے یعنی اُس چیز کے اہم پہلوؤں کو دیکھیں کہ وہ کون سی چیز ہے اگر کوئی شہر[ہے] تو اُسکے مراکز کو دیکھیں،اُس کے اونچے اونچے مقامات پر جائیں اور وہاں پر جھانکیں تو آپ کو پورے شہر کا پتہ چل جائے گا اور دنیا میں اِس چیز کی بہت سی آپ کو مثالیں ملیں گی کہ کسی کام کو آپ تفصیل سے کرنا چاہتے ہیں یا اُس کا Short Course کرنا چاہتے ہیں ۔جب آپ Short Course کرنا چاہتے ہیں تو وہ بھی کچھ اِس طرح سے ہو کہ پورا مطلب اُس میں سموجائے اور پوری چیز اُس سے Cover ہوجائے ۔میرا دعویٰ ہے[کہ] قرآن کے اندر کچھ ایسی آیتیں بھی ہیں جن کو سمجھنے سے پورا پورا قرآن Cover ہوسکتا ہے ۔لہٰذا ہماری جمعیت علم کے لحاظ سے کسی یونیورسٹی کی طرح Practical کام سے اِس جمعیت کی دلچسپی ہے،لہٰذا میں آپ کو یہ مشورہ پیش کرنا چاہتا ہوں کہ آپ یا تو پورے قرآن کو لیں یا آپ اُن آیتوں کو لیں جو تمام قرآن کو Cover کرسکتی ہیں، تمام قرآن کے مطالب اُس میں سموسکتے ہیں ۔تو اس کے لئے امام ہی نے اشارہ فرمایا کہ ولنا کرائم القرآن قرآن کی بزرگ بزرگ آیتیں ہماری شان میں ہیں تو اب سے آپ تہیہ کرکے رکھیں کہ قرآن کی بزرگ بزرگ آیتیں جو ہیں وہ آپ سمجھیں،اُس کے مطلب کو آپ

سمجھیں پھر ہم آپ سے اِس سلسلے میں مشورہ کریں گے۔

مثال کے طور پر آپ اس بیان کو یہاں رکھیں اور اس کے Side میں جائیں۔ میں نے ایک دفعہ کچھ قدرتی طور پر یہ طے کیا تھا یا میرے دل میں یہ بات آئی تھی، وہ بات میرے نزدیک بہت اچھی تھی وہ بات کیا تھی؟ میں نے سوچا تھا کہ قانونِ کُل کے نام سے ایک چھوٹی سی کتاب لکھی جائے۔ آپ کو معلوم ہے کہ مجھے یہ بات کہاں سے ملی؟ قرآن پڑھتے پڑھتے کیونکہ قرآن کے اندر کچھ ایسی آیتیں ملی تھیں کہ اُن کا تعلق کُلیّہ کے طور پر تھا۔ آپ جانتے ہیں کہ کُلیّہ کسے کہتے ہیں۔ یہ Formula کو کہتے تھے اور کُلیّہ لغوی طور پر ایسی بات کو کہتے ہیں کہ جو قانون کی حیثیت رکھتی ہے اور اس کُلیّہ کو کُلیّہ اِس لئے اور اِس معنی میں کہا جاتا ہے کہ اُس کے اندر کُل کا قانون ہوتا ہے۔ تمام باتوں پر اِس کا اطلاق ہوسکتا ہے اِس لئے اِس کو کُلیّہ کہتے ہیں اور شاید انگلش میں اسے Formula کہتے ہیں۔ کتنی اچھی بات ہے کہ قرآن کے اندر بھی کوئی Formula ہو یا کوئی کُلیّہ ہو۔ ہاں قرآن کے اندر کُلیّہ ہے اور میں نے اس کے ساتھ Deal بھی کیا ہے، شاید آپ نے خیال نہیں فرمایا ہے امام شناسی کے سلسلے میں جو تیسری جلد ہے اُسمیں میں نے اُن آیتوں کو لیا ہے جن میں ''کُل'' کا ذکر ہے۔ مثلاً ایک آیت ہے اُس کا Subject ایسا ہے کہ کُل سے اس کا کوئی Concern نہیں ہے، لیکن کوئی آیت ایسی بھی ہے جس کا Concern کُل سے ہے، All سے ہے جیسے کہ آپ کہتے ہیں، وَكُلَّ شَيْءٍ أَحْصَيْنَاهُ فِي إِمَامٍ مُّبِينٍ (۳۶/۱۲)۔ یہ ایک کُلیّہ ہے اور یہ [آیت] قانونِ کُل میں آسکتی ہے کیونکہ اِس کے اندر کُل کا ذکر ہے۔ کُل کا اِس معنی میں، اِس موضوع سے ذکر ہے کہ کُل یعنی تمام چیزیں یا کہ ہر چیز امامِ مبین کی ذات میں Limited ہے، محدود ہے، سموئی ہوئی ہے۔ تو یہ ایک مضمون کا کُلیّہ بن گیا۔

اسی طرح كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ (۳/۱۸۵) اور ہر جان، ہر جی موت کا مزہ چکھنے والا ہے۔ یہ بھی ایک کُلیّہ ہے کیونکہ اِس کے اندر کُل کا ذکر ہے۔ كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ (۵۵/۲۶) زمین پر جو بھی جیوَ رہتا ہے، جو لوگ زمین پر رہتے ہیں وہ سب کے سب فنا ہو جانے والے ہیں۔ یہ بھی ایک کُلیّہ ہے لہٰذا ایسی آیتوں سے قانونِ کُل بن سکتا ہے۔

میں نے یہ موضوع کیوں چھیڑا ہے؟ اس لئے کہ ابھی ابھی ذکر ہوا تھا کہ امام نے اشارہ فرمایا ہے کہ قرآن کے اندر سب آیتیں یکسان نہیں ہیں۔ کچھ آیتیں معمولی ہیں، کچھ آیتیں اعلیٰ سے اعلیٰ ہیں، یہ امام نے تصور دیا۔ اگر ہم کو پتہ چلے کسی طرح سے کہ قرآن کی اعلیٰ سے اعلیٰ ایتیں ہیں جنکے اندر قرآن کے بہت سے مطالب آسکتے ہیں تو ہم اُنکو Follow کرسکتے ہیں۔ انکی پیروی کرسکتے ہی، انکی حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کرسکتے ہیں پھر اسی طرح قرآن ہم سمجھ سکتے ہیں۔ قرآن اگرچہ ایک کائنات ہے، ایک بحرِ بے پایان ہے لیکن ہم اُس کو مختصر سے مختصر کرسکتے ہیں۔ سمندر اگرچہ بہت زیادہ ہے، اُس کو آپ تولیں اور ناپیں تو اُس میں بہت وقت لگے گا لیکن جہاز پر بیٹھیں آپ اور سمندر کو اور سمندر نیچے چھوڑیں سمندر کی سطح سے آپ جائیں اِس کنارے سے اُس کنارے تک پہنچیں تو آپ نے سمندر کو ختم کیا۔ اِس کی کیا ضرورت ہے کہ آپ سمندر کو تولنا چاہتے ہیں، اِس تولنے سے کیا ملے گا آپ کو۔ آپ سمندر کے اُوپر اُوپر سے جائیں۔ سمندر سے یہ فائدہ اٹھائیں کہ وہ آپ کے زیرِ پا آئے۔ اُس کو پامال کریں اور آپ پہنچیں منزلِ مقصود تک۔ جس طرح ہمارے عزیز اُستاذ نے کہا کہ علم میں کوئی گمراہ

بھی ہوسکتا ہے اور یہ بات صحیح ہے کیونکہ سمندر میں تو لوگ ڈوب جاتے ہیں۔ اسی طرح علم میں بھی لوگ مستغرق ہو جاتے ہیں، غرق ہو جاتے ہیں، لیکن علم ہلاک کر دینے کے لئے نہیں ہے، علم رہنمائی کے لئے ہے، علم آنکھ بن کر منزلِ مقصود تک پہنچانے کے لئے ہے۔ لہٰذا آپ سارے علم کو اپنے پاؤں کے نیچے لائیں اور علم کی سطح سے آپ چلیں اور منزلِ مقصود کو پہنچیں، تو قرآن کے اندر بھی اِس کا اشارہ ملتا ہے کہ خداوندِ عالم نے بہت سے لوگوں کو علم سے گمراہ کر دیا ہے اور جس کو ہادیٔ برحق نہیں ملتا ہے اور وہ ظاہری علم پر نازاں ہوتا ہے، فخر کرتا ہے تو وہ بیشک گمرہ ہو جاتا ہے۔

اِس مختصر سے موضوع کا مقصد یہ تھا کہ میں آپ کو بتاؤں کہ قرآنی علم حاصل کرنے کے لئے مختصر سے مختصر طریقہ بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ آپ قرآن کی بزرگ بزرگ یعنی بڑی بڑی آیتوں کو لیں اُن کے مطلب کو سمجھیں اور پھر اُن آیتوں کے اندر قرآن کے سارے علم کو پائیں، اُن بزرگ آیتوں کے مینارے بنائیں اور اُن میں سے آپ جھانکیں امام کے نور کی روشنی میں دنیائے قرآن کو دیکھیں تا کہ آپ پر روشن ہو جائیگا یا یہ کہ آپ قانونِ کُل کو سمجھیں۔

ہر جان کو موت کا مزہ چکھنا ہے تو اِس کو کس طرح سمجھیں، اِس کو اِس طرح سے سمجھیں کہ یہ جب کُلّیہ ہے، یہ جب قانونِ کُل کا ایک جُز ہے تو اِس سے کوئی شخص نہیں بچ سکتا ہے، اِس کا مطلب یہ ہوا کہ دنیا کے اندر نہ کوئی خضر ہے، نہ کوئی الیاس ہے زندہ جسمانی طور پر، نہ آسمان پر عیسیٰ ہے، نہ کوئی کسی مقام پر ایسا کوئی مہدی ہے، کوئی نہیں ہے، سوائے امامِ زمان کے، اور امامِ زمان بھی ہے تو وہ اِس طرح سے ہے کہ وہ جامہ تبدیل کرتا ہے، اِس قانون کے تحت۔ اِس قانون سے کوئی نفس نہیں بچتا ہے۔ قانونِ کُل اللہ تعالیٰ کا ایسا ہے کہ اِس قانونِ کُل کو اِس طرح سے سمجھیں، تا کہ آپ کے لیے یہ مطلق قانون بن جائیگا اور قطعی طور پر آپ کو فیصلہ کر کے بتائے گا کہ دنیا کے اندر جو لوگ ہیں اور جس طرح سوچتے ہیں کتنا غلط سوچتے ہیں اور کس قدر قرآن کے برعکس سوچتے ہیں، یہ امام کے نور کی روشنی ہے جو اسماعیلی سمجھتے ہیں حقیقتوں کو پاتے ہیں اور قرآن کی روح کو سمجھتے ہیں۔

ٹائپ: اکبر علی، پروف: نسرین اکبر

استادِ بزرگوار علامہ نصیر الدین نصیرؔ ہونزائی (ق) کا پُرحکمت بیان

عنوان: علمی خدمت کی اہمیت

کیسٹ نمبر: ٦ تاریخ: ۱۹۷۷، کراچی

Click here for Audio

ہمیں بہت ہی شکرگزار ہونا چاہئے کہ خداوندِ برحق نے ہم کو دین کی عظیم نعمت عطا کر دی ہے اور ساتھ ہی ساتھ دُوسروں سے بڑھ چڑھ کر اُس کی شناخت بھی ہم کو عطا کی ہے۔ علاوہ ازین ہم کو آپ کو اُس نے یہ توفیق عنایت کی ہے کہ ہم آپ مل کر کوئی مفید اور اہم خدمت انجام دیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ حقیقی مومن ہر وقت اپنے پیارے خداوند سے توفیق کے لئے دُعا کرتا ہے اور اِس توفیق میں مومن یہ چاہتا ہے کہ اُس سے کوئی خدمت انجام پائے، وہ کہتا ہے کہ مولا! اپنے مقدّس در کی خدمت کرنے کی توفیق عطا کرنا، وہ دُعا مانگتا ہے کہ یا مولا! مجھے آپ کی پیاری جماعت کی خدمت نصیب ہو۔

آپ اِس ایک لفظ جماعت کو لیں، کیا اِس سے یہ مُراد ہو سکتی ہے کہ کسی ایک جماعت خانے کی جماعت امامؑ کی پوری جماعت ہو سکتی ہے یا اِس دُعا میں دُنیا بھر کی پوری جماعت کا ذکر ہے۔ آپ کہیں گے، آپ مانیں گے، آپ قبول کریں گے کہ اِس میں وہ تمام اسماعیلی شامل ہیں، اُن تمام اسماعیلیوں کا ذکر ہے جو امامؑ کی مُریدی میں ہیں، جو دنیا کے مختلف ممالک میں پائے جاتے ہیں، اِس سے آپ سمجھ گئے کہ لاشعوری طور پر آپ وسیع تر خدمت کے لئے توفیق مانگتے ہیں۔ ٹھیک ہے اِس سے انکار نہیں ہے کہ خدمت کچھ نہ کچھ ہونی چاہئے، اگر بڑی خدمت نہ ہو تو چھوٹی خدمت بھی غنیمت ہے اِس حالت سے کہ کوئی مومن بیکار بیٹھے اور خدمت سے الگ رہے۔ تو اِس کے لئے چھوٹی خدمت بھی ایک غنیمت شیٔ ہے۔ بہر حال رُوح کا، عقل کا یہ تقاضا ہے کہ آپ کی خدمت وسیع پیمانے پر ہو ایک بات اور دُوسری چیز یہ ہے کہ خدمت کونسی ہونی چاہئے؟ خدمت وہ ہو جس کی دُنیا زمانے میں ضرورت رہتی ہے اور وقت کے تقاضے کے مطابق جس کی انتہائی ضرورت ہوتی ہے وہی خدمت ہے جس کو انجام دینا چاہئے اور جس کی انجام دہی میں بہت بڑی فضیلت ہے، بہت بڑا ثواب ہے۔

الحمد للہ! یہ تمہید آپ کی اِس وسیع خدمت کے مطابق ہے جو آپ علم کے مقصد کو آگے سے آگے بڑھانے کے سلسلے میں انجام دیتے ہیں۔ آپ کو معلوم ہی ہے کہ علم ہی وہ چیز ہے، علم ہی وہ شیٔ ہے، علم ہی وہ خدمت ہے جس کی جماعتوں کو سخت سے سخت ضرورت ہے۔ یہ اِس لئے کہ علم سب کچھ ہے یعنی دینی علم، دینی علم ہی رُوحانی جہاد ہے جس کے ذریعے سے جہالت کو دُور کیا جا سکتا ہے، جس کے وسیلے سے روشنی پھیلائی جا سکتی ہے، عقل و دانش کی روشنی، حکمت کی روشنی، تاویل کی روشنی اور ہدایت کی روشنی، تو اِس کے لئے آپ نے کمرِ ہمّت باندھا ہے اور آپ کی کوششیں اِس سلسلے میں جاری و ساری ہیں، اِس لئے مجھے آپ کو آج کے موقع پر آج کے اِس دن مبارکباد دینا چاہئے کہ آپ خوش نصیب ہیں، آپ بڑے خوش قسمت ہیں کہ کسی نہ کسی طرح سے آپ کو توفیق ملی ہے، آپ کی کسی دُعا کے نتیجے میں آپ کو یہ

ہمّت دی گئی ہے کہ آج آپ اِس خدمت میں لگے ہوئے ہیں۔

یاد رہے کہ جب مومن کسی نیک حاجت کے لئے دُعا کرتا ہے تو خداوند چونکہ حکیم ہے، چونکہ دانا ہے، چونکہ وہ مہربان ہے اپنے بندۂ مومن پر اور اِس کی بہتری ،صلاح سب کچھ وہی بہتر جانتا ہے، لہٰذا بعض دفعہ خداوند ایسا کرتا ہے کہ مومن جو چیز مانگتا ہے خداوند وہ اُس کو عطا نہیں کرتا بلکہ کوئی ایسی چیز عطا کرتا ہے بعض دفعہ جو کہ وہ اِس سے کہیں زیادہ بہتر ہوتی ہے۔ تو اسی طرح ہوسکتا ہے کہ آپ نے کسی دن کوئی حاجت طلب کی ہوگی لیکن مولا نے آپ کی رُوح سے فرمایا ہوگا کہ دیکھو! میں تم کو یہ چیز نہیں دیتا ہوں بلکہ اِس کی جگہ پر دُوسری کوئی چیز دیتا ہوں جس میں زیادہ سعادت ہے، جس میں زیادہ فضیلت ہے۔ بہرحال یہ توفیق جس کی بدولت آپ ایک عالم گیر خدمت میں شرکت کر رہے ہیں مولا ہی سے ملی ہے۔

میں نے اِس چھوٹی سی خدمت کو عالم گیر خدمت قرار دیا ہے، یہ بات کہاں تک دُرست ہوسکتی ہے۔ ظاہر ہے اور آپ جانتے بھی ہیں علم کی مثال ایک لہر کی طرح ہے، لہر تالاب میں ہو یا سمندر میں وہ تو کنارے تک ہی پہنچ جاتی ہے۔ لہر شروع میں چھوٹی سی ہوتی ہے [یا] موج لیکن وہ آگے سے آگے بڑھ کر بڑی ہوسکتی ہے اور زوردار ہوسکتی ہے اور کنارے تک پہنچ سکتی ہے۔ یہ ایک عظیم لہر ہے جو دُنیائے اسماعیلیت کو اپنی لپیٹ میں لینے والی ہے۔ علم کی جس تحریک میں، علم کے جس ادارے میں آپ شرکت کر رہے ہیں اِس کی سخت ضرورت ہے، آگے چل کر یہ خدمت پوری دُنیائے اسماعیلیت کے لئے بہت ہی مفید ثابت ہوگی اور میں دعوے سے کہتا ہوں کہ اِس سے بہت سے ادارے فائدہ اٹھائیں گے۔ آپ کی شائع کی ہوئی کتابیں دُنیا بھر کے اسماعیلیوں کے ہاتھ آئیں گی اور اسکالرز اِن کتابوں کا مطالعہ کریں گے، اداروں میں پہنچیں گی، واعظین، گائیڈز، ماسٹرز اور طلباء اور ریسرچ کرنے والے اور لکھنے والے سب اِن کتابوں سے استفادہ کرنے لگیں گے اور خصوصاً ایسی بھی اُمید ہے کہ آپ کا جو سب سے بڑا ادارہ ہے اُس تک اِس کی رسائی ہوگی اور پھر اُس وقت آپ کی خدمات رنگ لائیں گی اور اُن کا میٹھا پھل آپ کو ملے گا، جماعتوں کے سامنے وہ پھل پیش ہوگا۔

دیکھئے! دُنیا کے اندر کوئی بھی طاقت شروع شروع میں دیکھا جائے تو ایک معمولی چیز کے اندر پوشیدہ ہوتی ہے، کوئی بھی طاقت شروع شروع میں اِس قدر چھوٹی ہوتی ہے کہ بعض لوگ اُس کو کوئی اہمیت نہیں دیتے ہیں، بلکہ اُس کو حقیر سمجھتے ہیں لیکن وہی چیز آگے چل کر ایک عظیم طاقت کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ آج دنیا کے اندر جن اداروں کو جن تحریکوں کو یاد کیا جاتا ہے وہ بھی شروع شروع میں چھوٹی چھوٹی چیزوں کی حیثیت سے تھیں۔ مثلاً اخوان الصّفا کو دیکھئے اور قاہرہ یونیورسٹی کو دیکھئے کہ شروع میں اِس کی کیا حیثیت تھی اور اب اُس کی کیا حیثیت ہے۔ اِس لئے بہت ممکن ہے کہ آج آپ جس چھوٹی سی تحریک کو چلا رہے ہیں، یہ علمی تحریک ہے، سیاسی نہیں ہے ہوسکتا ہے کہ کسی وقت میں یہ کوئی بڑے ادارے کی شکل اختیار کرے اور اِس پر ریسرچ کا کام ہو جائے۔ آج نہیں کل نہیں کچھ وقت کے بعد اور لوگوں کو احساس ہو کہ اِس کے اندر جو کچھ کام ہوا ہے بہت ہی مناسب اور بہت ہی مفید کام ہے۔

اِس کے علاوہ ایک خاص بات میں آپ کو بتاؤں، جو مجھے اس موقع پر بتانا چاہئے وہ یہ کہ بہت ہی ممکن ہے کہ اِس کے پس منظر میں کوئی خدائی مصلحت ہو، امامؑ کا کوئی پروگرام ہو، وقت کا کوئی تقاضا ہو اور یہ کوئی ایسی چیز ہو جس کے متعلق قرآن میں حدیث میں اور

بزرگانِ دین کے اقوال میں پیش گوئی پائی جاتی ہے۔یعنی آپ کا یہ کام اِس قسم کا ہو،اِس نوعیت کا ہو جس کے متعلّق دین کے کسی مقام پر پیش گوئی کی گئی ہے،تو پھر اِس کام کی کتنی اہمیت ہوگی، میں واضح الفاظ میں فی الحال نہیں بتا سکتا ہوں لیکن آپ سمجھتے ہیں کہ آپ کیا کام کر رہے ہیں،ہم نے اِس سلسلے میں بہت سے اشارے کئے ہیں بہت سی باتیں ہوئی ہیں کہ یہ جو کام ہو رہا ہے یہ وقت کا،زمانے کا ایک اہم تقاضا ہے۔کیونکہ کوئی بھی اچھا کام،علم کا کام،معرفت کا کام وہ امامؑ کے ارادے کے بغیر اور اُس کے پروگرام کے بغیر نہیں ہوتا ہے۔ اسماعیلی مذہب ظاہر سے باطن میں زیادہ منظّم ہے یعنی ظاہر میں آپ باور کرتے ہیں کہ ہماری جماعت ہمارا مقدّس مذہب منظّم ہے یہ تنظیم کے طور پر کام کرتا ہے لیکن اِس کا نظم ونسق ظاہر سے باطن میں کہیں زیادہ ہے۔جس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ امامؑ کے پروگرام کے بغیر نہیں ہے۔امامؑ جب کوئی کام کرنا چاہتا ہے تو کسی شخص کو تیار کرتا ہے،کسی شخص کو تیار کرتا ہے،امامؑ ہی یہ کام کرتا ہے،اُس شخص کو پتہ نہیں ہوتا ہے،وہ جانتا نہیں ہے وہ اس خدائی پروگرام سے بے خبر ہوتا ہے وہ لاعلم ہوتا ہے۔لیکن امامؑ اُس کو بتائے بغیر اُس کو پروگرام سمجھائے بغیر اُس کو تیار کرتا ہے اور اُس سے کام لیتا ہے وہ خود لیتا ہے ہمارا آپ کا کام کچھ ایسا ہے۔آپ سوچیں بعد میں بھی آرام سے سوچیں یہ بات جو ہے کس حد تک صحیح ہوسکتی ہے۔

آپ کو اِس گفتگو پر روشنی ڈالنے کے لئے فرامینِ اقدس سے کافی مدد ملے گی کہ امامؑ نے اپنے ارشادات میں فرمایا ہے کہ ہم نے مختلف زمانوں میں کام کرنے والے آدمی پیدا کئے ہیں،ہمارے عقیدے کے مطابق امامؑ کوئی مُلا،مولوی جیسے نہیں ہیں وہ امامؑ ہیں اور امامؑ کے معنی ہم اِس طرح سے لیتے ہیں کہ امامؑ علم کے خدمت گزاروں کو،دین کے خادموں کو مہیّا کرتا ہے،اُن کو پیدا کرتا ہے،بناتا ہے،اُن کو روحانی پرورش دے کر،اُن کو تربیت دے کر،اُن کو علم کی غذائیں پہنچا کر تیار کرتا ہے،وقت اور زمانے کے تقاضے کے مطابق لوگوں کو،خدمت کرنے والوں کو پیدا کرتا ہے۔لہٰذا آپ ہم ان شاءاللہ!اسی پروگرام کے تحت کام کرتے ہیں اور جیسا کہ میں نے آپ سے گزارش کی کہ ہمارا مقدس مذہب ظاہر سے باطن میں کہیں زیادہ منظّم ہے۔آپ کو یاد ہوگا کہ حضرت مولانا سلطان محمد شاہ صلوات اللہ علیہ نے اپنے ارشاداتِ اقدس میں کہیں یہ فرمایا ہے کچھ عملداروں کو ٹائٹل وغیرہ عطا کرتے ہوئے کہ"یہ تو ایک ظاہری رسم کی چیز ہے مومن کو چاہئے کہ وہ باطنی طور سے جو اعزاز ہے اِس کو حاصل کرنے کے لئے کوشش کرے"۔اِس کا مطلب یہ ہوا کہ ظاہری اعزاز سے بڑھ کر باطنی اعزاز ہے اور اگر ظاہر میں ٹائٹل ہیں تو اِن جیسے ٹائٹلز باطن میں بھی ہیں جو زیادہ پائیدار ہیں،جو زیادہ دُرست اور زیادہ صحیح ہیں،جو زیادہ حقداری کے ساتھ ہیں۔

اِس مقام پر میں ایک تذکرے کی طرف اشارہ کرتا ہوں شاید آپ عزیزوں سے میں نے کبھی کہا تھا کہ میں نے ایک نورانی خواب دیکھا تھا مملکتِ چین میں اور اُس خواب کے اندر مولا کو ایک سفید چوغے میں ملبوس دیکھا تھا اور اُس چوغے کے اندر باہر بہت سے میڈلز لگے ہوئے تھے،تمغے تھے ذرا جگہ خالی نہیں تھی کہ اُس پر میڈلز لگے ہوئے تھے اندر باہر تو مولا نے اِس ناچار بندے سے پوچھا کہ تم جانتے ہو کہ یہ میڈلز کیا ہیں؟ میں نے عرض کیا،یا خداوند! خداوند ہی بہتر جانتا ہے مجھے اِس کا کوئی علم نہیں ہے تو خداوند نے فرمایا کہ دیکھو!یہ جو میرے چوغے کے باہر کی طرف میڈلز ہیں وہ میرے ظاہری عملدار ہیں اور جو اس چوغے کے اندر کی طرف ہیں وہ میرے باطنی عملداران ہیں۔بہرحال پھر اُس کے بعد اِس ناچار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بھی کچھ فرمایا لیکن مجھے مزہ نہیں دیتا ہے کہ یعنی اُس کی

وضاحت کروں۔

بہر حال آپ کو یقین ہوگا کہ امامؑ کا کام نہ صرف ظاہر میں چلتا ہے بلکہ اُس سے کہیں زیادہ منظّم طریقے سے باطن میں چلتا ہے اور اِس گفتگو کی غرض یہ ہے کہ آپ باور کریں آپ جو کچھ بھی خدمت انجام دیتے ہیں اُس کا ایک صلہ ہے، اُس کا ایک معاوضہ ہے وہ ایک فضیلت ہے، وہ ایک مرتبت ہے۔ اگر سب کام ظاہر پر چھوڑ دیا جائے اور باطنی طور پر کچھ بھی نہ ہو تو پھر دین کا کام کس طرح چلے گا۔ ٹھیک ہے جس حد تک ظاہری کام چلتا ہے وہ دُرست ہے اور جن کو باطنی طور پر کام کرنے کی اہلیت ہے انہیں باطنی طور پر کام کرنا چاہئے اور خداوند پر بھروسہ رکھنا چاہئے۔ مثال کے طور پر اگر یہ دیکھا جائے اور یہ سوچا جائے کہ ظاہر میں جو کام ہے وہ ہی کافی ہے تو پھر سب کی نظر ظاہر پر ہوگی اور بہت سے لوگ جن کو ظاہر میں خدمت کے لئے موقع نہیں ملتا ہے وہ مایوس ہو جائیں گے اور اُدھر سے خدمت بھی ادھوری رہ گئی کہ تمام خدمت ظاہری صورت میں انجام نہیں پائے گی اور جماعت کے بہت سے افراد خدمت میں شرکت نہیں کر سکیں گے اور اِس سعادت سے اُن کو محرومی ہوگی۔ لہٰذا باطنی خدمت کا جو دروازہ ہے ہر وقت کھلا ہے۔ اُس کے لئے کسی کی سفارش کی کوئی ضرورت نہیں ہے وہ مومن خود از خود کر سکتا ہے یہ نیکی کا دروازہ ازل سے لے کر ابد تک کھلا ہے۔ تو یہ ہے آپ کے کام کی نوعیت اور آپ کی خدمت کی اہمیت۔

اس کے لئے آپ کو غور کرنا چاہئے کہ اِس وقت اتنی تمام کوششوں کے باوجود علم کا جو مقصدِ اعلیٰ ہے وہ حاصل نہیں ہو رہا ہے اور امامؑ کے بہت سے خزانے علم کے کام کی تکمیل کے لئے صَرف ہو رہے ہیں۔ امامؑ جس عظیم کام کے لئے اتنے سارے خزانے صَرف کرتے ہیں، خرچ کرتے ہیں کیا اِس سے علم کی اہمیت کا اندازہ نہیں ہوتا ہے۔ ضرور ہوتا ہے، اِس سے امامؑ کا منشاء بھی معلوم ہوتا ہے کہ امامؑ علم کو بہت چاہتا ہے، علم کو چاہنے کا ثبوت اِس سے بڑھ کر اور کیا ہو کہ امامؑ نے دنیائے اسماعیلیت کے اندر اتنے ادارے علم سے متعلّق قائم کئے ہوئے ہیں اور وہ ادارے اپنی خدمات میں کس حد تک کامیاب ہیں اُس کا مجھے تذکرہ نہیں کرنا چاہئے، لیکن انداز یہ ہے، ثبوت یہ ہے کہ پھر بھی علم کی ضرورت ہے۔ یہ جماعتوں کے اندر اور پوری دنیائے اسماعیلیت میں علم کی جو کمی ہے وہ کمی کہہ رہی ہے کہ ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ پاکستان کو لیجئے یہاں ہمارے مقدّس مذہب میں اور ہمارے ان مقدّس اداروں کی طرف سے اِس قدر کوشش کے باوجود کتنی کمی ہے علم کی بہت کچھ کمی ہے، بہت کچھ کمی ہے، اگر ہم نیک نیتی سے علم کی خدمت انجام دیتے ہیں تو اِس کا ہم کو کئی کئی گنا صلہ ملنا چاہئے کیونکہ ہم اگر اپنی اس کوشش میں کامیاب ہو جائیں یا کسی حد تک ہم کام کر سکیں تو یہ ہماری مدد ہوگی، تعاون ہوگا اپنے اداروں سے، جماعتوں سے اور یہ خدمت ہوگی دین کی، امامؑ کی، اسماعیلی مذہب کی۔ اِس کے اندر گوناگون نیکیاں ہیں۔ بہت سی بھلائیاں ہیں۔

اِس کے علاوہ ایک چیز میں آپ کو آخیر میں اور بتاؤں گا وہ یہ کہ زمانۂ قدیم میں رسول اللہؐ کے زمانے میں آپ کو معلوم ہے کہ بیتُ المال کس لئے زیادہ سے زیادہ خرچ ہوتا تھا۔ غلاموں کے خریدنے میں، جہاد کے لئے سامان مہیّا کرنے میں اور قیدیوں کے چھڑانے میں، غریبوں، یتیموں، مسکینوں کو کھانا کھلانے میں اور اُن کے لئے لباس مہیّا کرنے میں۔ آپ فوراً ہی یہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اُس زمانے کے جو تقاضے تھے وہ موجودہ وقت سے مختلف تھے یعنی اُس وقت جو کچھ کرنا چاہئے تھا وہ موجودہ وقت سے الگ تھا۔ جیسا کہ جہاد کے لئے گھوڑے خریدنا، تلواریں خریدنا، گُرز، زِرّہ بکتر وغیرہ اُس زمانے کے مطابق جو ہتھیار استعمال ہوتے تھے اُن کو مہیّا کرنا وغیرہ۔

کیونکہ اُس وقت یعنی سائنس کی اتنی ترقی نہیں تھی، اتنے علوم نہیں تھے اور اِس قدر دُنیوی علم بھی نہیں تھا اور علم وفن کی اتنی ترقی نہیں تھی، زمانہ بہت ہی [محدود تھا]، زمانے کی ضرورتیں بہت ہی محدود تھی، ترقی بہت ہی محدود تھی بلکہ ترقی نہیں تھی۔ لہٰذا اُس وقت دین کے سلسلے میں جس نوعیت کی کوشش ضروری تھی وہ بالکل الگ تھی۔ لیکن اب جو زمانہ آپ کے سامنے ہے جس میں آپ ہم زندگی گزار رہے ہیں اِس زمانے کے تقاضے بالکل مختلف ہیں۔ پھر سب سے بڑی نیکی اِس میں ہے، اِس بات میں ہے کہ آپ علم کی خدمت انجام دیں یہی علم کسی کی آنکھ بن سکتا ہے تو زہے خوشی کہ آپ کا علم اتنا کام کرسکتا ہے۔

معجزات کی تاویل آسکتی ہے آپ نے سنا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ مادرزاد اندھوں کو اچھا کر دیتا تھا، اُن کو بینائی بخشتا تھا اور ہر قسم کی بیماری کے لئے شفاء عطا کرتا تھا اور اِس قسم کے معجزات وہ کرتا تھا۔ تو امامؑ کی فضیلت سے اُس کی مہربانی سے آپ بھی یہ کام کرسکتے ہیں، علم ہی میں رُوح ہے، لاعلمی موت ہے، علم ومعرفت زندگی ہے۔ تو آپ اگر ایک جاہل کو عالم بنائیں، ایک بے دین کو دیندار بنائیں تو مانا جائے گا کہ آپ نے اُس کو رُوح عطا کی، وہ مُردہ تھا آپ نے اُس کو زندہ کیا، وہ اندھا تھا آپ نے اُس کو آنکھ دی، وہ لنگڑا تھا آپ نے اُس کو پاؤں عطا کیے، وہ لُولا تھا آپ نے اس کو ہاتھ دئے، وہ یتیم تھا آپ نے اُس کی خبر گیری کی، اُس کے جسم پر لباس نہیں تھے آپ نے اُس کو تقویٰ کا لباس پہنایا، وہ بھوکا تھا آپ نے اُس کو کھلایا، پلایا، وہ رستے سے بھٹکا ہوا تھا آپنے اُس کو رستے پر لایا تو یہ تمام معنی علم کی خدمت میں آسکتے ہیں، لیکن آخر کار آپ ہم اِس کام کو امامؑ سے منسوب کریں گے کہ امامؑ نے یہ کام کیا۔ عاشقی یہ ہے کہ آپ اپنی خدمت کو آخر میں امامؑ سے منسوب کریں کہیں کہ شکر ہے مولا! تو نے یہ نعمت دی تھی اور تیری یہ نعمت تیری راہ میں صَرف ہوئی شکر ہے مولا! تو نے مجھے یہ فضیلت عنایت کی، تو نے ہی مجھے یہ موقع فراہم کیا ورنہ میں کیا تھا اور میری کوشش کیا تھی، میں کہاں اور یہ سعادت کہاں یہ شرطِ ادب ہے۔ آپ آخر میں کہیں کہ نابینا کو آنکھ دینے والا تو ہی ہے، مُردے کو زندہ کرنے والا تو ہی ہے، تو خداوند [تو] ہی ہے، مالک [تو] ہی ہے، کام کو، کارنامے کو، خدمت کو، فتح کو آخر سردار سے منسوب کیا جاتا ہے۔ اگر اِس جنگ میں آپ کو کامیابی ہوئی، فتح ہوئی تو سب سے اُوپر کی نیک نامی آپ کے سردار کی ہے، پھر وہ آپ کو نوازے گا آپ اُس کے لشکر میں [ہیں]۔ ایک نیک نام اور بہادر سپاہی خدمت کرکے اپنی خدمات کو اپنے آفیسر کے سامنے پیش کرتا ہے اِس میں گنجائش ہے کہ آفیسر کی بھی نیک نامی ہو اور سپاہی کی بھی۔ نیک نامی، علم، اچھائی ایک روشنی ہے، اگر آپ ایک چراغ روشن کرتے ہیں کسی مہمان کے لئے تو سب روشنی اور سب کرنیں اُس کی طرف متوجہ تو نہیں ہوتی ہیں وہ بالکل یکسانیت کے ساتھ کمرے میں، ہال میں بکھر جاتی ہیں اور گو کہ چراغ آپ نے اُس مہمان کے لئے جلایا ہے، دسترخوان آپ نے مہمان ہی کے لئے بچھایا ہے لیکن اُس کے طفیل سے یہ چیز، یہ فیض، یہ روشنی سب میں عام ہوجائے گی۔

تو نیکی میں اتنی گنجائش ہے کہ سب کو اِس سے فیض ملتا ہے سب کو خوشی ہوتی ہے۔ خداوندِ عالم نے مادّی روشنی کا سرچشمہ جو سورج ہے اُس کی شکل کچھ ایسی بنائی ہے کہ وہ گول ہے اور اُس کی روشنی چارسو پھیلتی رہتی ہے یعنی سورج سے جو کرنیں پھیل جاتی ہیں، سورج سے جو بے پناہ روشنی بکھر جاتی ہے وہ کسی ایک طرف کو نہیں جاتی بلکہ اِس عظیم کائنات کی شش جہت کو یعنی چھ اطراف کو وہ روشنی گولائی میں برابر برابر جاتی ہے، سب کے لئے [وہ] روشنی کافی ہوجاتی ہے اور روشنی وہاں بھی جاتی ہے جہاں پر کہ ضرورت بھی نہیں ہے تاکہ ثبوت ہو

جائے کہ خدا کی رحمت کس قدر عام ہے اور کتنی بے پناہ ہے تو یہ سخاوت کا ثبوت ہے۔ آپ جو خدمت کریں گے اُس میں سے جو اہل ہیں اُن کو بھی فیض ملے گا اور جو نا اہل ہیں اُن کو بھی ملے گا خواہ وہ اُس سے فائدہ نہ اٹھائیں لیکن اُن سب کو ملے گا ۔

تو آپ کو یہ بھی اشارہ کروں کہ آپ ہم ایک ایسے زمانے میں دنیا میں آئے ہیں کہ اِس زمانے کی بڑی اہمیت ہے ہم ایک ایسے امامؑ کے دَور میں پیدا ہوئے ہیں جو کہ وہ ساتواں امامؑ ہے بلکہ سات دفعہ ساتواں ہیں۔ اِس لحاظ سے آپ اپنی دینی اہمیت کو اور رُوحانی مرتبت کو سمجھیں اور آپ جانتے ہیں کہ سب سے پہلے آپ یہ غور کریں کہ زمانہ کیسا ہے بڑا اہم ہے بڑا International ہے، دُنیا کی تمام قوموں کا آپس میں ملاپ ہے، کوئی Cut off نہیں ہے، کوئی کسی گوشہ میں نہیں ہے اور دُنیا کی قوموں کے آپس کے تعلقات اتنے استوار اور ایسے مضبوط ہو چکے ہیں۔ آج کل عقل و دانش کی بڑی بڑی اہمیت ہے اور دین کے علم کی بھی بڑی بڑی اہمیت ہے یہ اندرونی طور پر ایک سرد جنگ جیسی کیفیت ہے، ابھی ریسرچ کا زمانہ ہے، آرام آرام سے ریسرچ ہوگی ہر مذہب پر تحقیق ہوگی، دانشور خود کریں گے، حکومت خود کرے گی، مذہب والے بھی کریں گے ہر کوئی اپنی آزادی سے اظہارِ خیال کرنے کا حق رکھتا ہے اور آزادی ہے۔ اِس میں حق کے لئے بہت بڑا موقع ہے، حق کے لئے، اب یہ حق دبے گا نہیں، اب یہ حق کی قدر دانی ہوگی، اب یہ حق آگے بڑھے گا اور جو تعصب کا زمانہ تھا وہ گزر گیا اب وقت ایسا آیا ہے کہ بہت کچھ آپ کے مذہب کا کام دُوسرے لوگ کریں گے۔ وہ اپنے فرض کے طور پر کریں گے وہ اس لئے کریں گے کہ وہ دانشور ہیں اور دانشوری کا یہ تقاضا ہے کہ کچھ کام کریں، ریسرچ کریں، اگلے زمانے میں لوگوں نے کس غلط بیانی سے کام لیا، کس طرح غلط بیانی سے کام لیا، کس طرح انہوں نے قلم کو غلط طریقے سے استعمال کیا وہ کتنے متعصب تھے اور کہاں کہاں انہوں نے غلطیاں کی ہیں اور کس پر ظلم ہوا ہے۔ اب اس پر تحقیق ہو رہی ہے یعنی ریسرچ ہو رہی ہے ایک طرف اور دُوسری طرف سے امامؑ نے چاہا ہے کہ International Level پر یعنی عالمی Level پر، عالمی سطح پر ایک ادارے کو قائم کریں کتنے برس کے بعد اُس میں سے بہت کچھ ذرِّ کثیر خرچ کر کے ایسے علم کو ایسی زبان میں پیش کریں جس کو دنیا والے مانیں، دنیا والوں کی زبان میں ہو وہ بات، وہ علم، وہ تواریخ، وہ مذہب، تو کیا ایسے میں آپ ہم فضول ہو سکتے ہیں۔ آپ کی ہماری کوششوں کی کوئی قدر دانی نہیں ہوگی، اِس میں خداوند کا کوئی ہاتھ نہیں ہے، ضرور ہے، ضرور ہے۔ جب آپ ہم اِس معنی میں مطمئن ہیں اور ہمارا کام بہت اہم کام ہے تو پھر ذوق و شوق سے اِس کام کو آگے بڑھانا چاہئے۔ بعض دفعہ ہمیں اپنے کام کو Count کرنا چاہئے، اطمینان کے لئے دیکھنا چاہئے کہ ہماری کتنی کتابیں ہیں، کتنے مقالے ہیں، کتنا کام ہے اور کتنی زبانوں میں یہ ہو رہا ہے اور یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ اِس کا فائدہ کس طرح سے حاصل ہو رہا ہے۔ آیا جماعتیں جو علم دوست ہیں، جو دانشور ہیں، جو بصیرت والے ہیں وہ اِس سے مطمئن ہیں یا مطمئن نہیں ہیں، اِس کو بھی دیکھنا چاہئے۔ یہ دانشمندوں کا کام ہے کہ اپنے کام کی نوعیت کو اُس کی Progress کو اور اُس کے پس منظر کو اور اس کے دُور رس نتائج کو دیکھتے ہیں، اِن تمام چیزوں پر غور کئے بغیر اندھا دھند کوئی کام نہیں کرنا چاہئے، کوئی کام نہیں کرنا چاہئے۔

اچھا جب ہر طرح سے آپ کو اطمینان ہے تو پھر آپ آرام آرام سے یہ کام کر سکتے ہیں۔ اِس کے علاوہ ایک اور چیز میں آپ کو بتاؤں آپ کو معلوم ہے کہ ہم الحمدللہ مسلمان ہیں، سب سے پہلے ہم مسلمان ہیں اور پھر اسماعیلی ہیں اِس صورت میں ہم کو قرآن سے کس قدر

وابستگی ہے اِس کا آپ کو اندازہ ہے۔قرآن سے وابستگی ہر حالت میں ہے اور ہونی چاہئے، اگر ہم کو قرآن سے وابستگی ہے تو آپ غور کریں کہ اِس وقت قرآن پر کہاں کہاں کام ہو رہا ہے اگر کہیں بھی کام نہیں ہو رہا ہے تو پھر آپ کے کام کی اور زیادہ اہمیت ثابت ہوگی اور اگر کہیں کام ہو رہا ہے تو اُس کے ساتھ آپ اپنے کام کا موازنہ کریں کہ اُس کے Standard کا ہے یا نہیں ہے اگر ہے تو ٹھیک ہے اگر نہیں ہے تو کوشش کریں۔اگر قرآن پر کہیں بھی کام نہیں ہو رہا ہے تو آپ اور بھی اِس میں کوشش کریں۔علیٰ ہذا القیاس تاویلات، اسماعیلی فلسفہ اور رُوحانیت آپ اپنے مضامین کو دیکھیں کتنے اہم مضامین ہیں۔یہ خداوند کی مصلحت ہے کہ ہم کو، آپ کو ایسے رستے پر ڈالا اور یہ کام دیا، اگر ہمارا میدان تواریخ کا ہوتا یا ظاہری فلسفے کا ہوتا یا کسی ایسے Subject کا ہوتا تو اُس کی چنداں اہمیت نہیں ہوتی، کیونکہ ہم سے بڑھ کر دنیا کے اندر کتنے ڈاکٹر ہیں، کتنے دانشور ہیں اور اُن کی Language کتنی اچھی ہے صاف ہے لیکن اُس وقت ہم اپنے کام سے مطمئن نہیں ہوتے کہتے کہ یہ کام تو دُوسرے لوگ بھی کرتے ہیں۔جب ہمارا کام منفرد ہے تو ہمیں سمجھنا چاہئے کہ خداوند نے اپنی مصلحت سے اِس کام کے لئے آپ کو ہم کو متعیّن کیا ہے، مقرر کیا ہے، ہمیں یہ کام ضرور کرنا ہے، یہ کام کر کے چلے جائیں گے اور پھر جب اِس پر توجہ ہوگی لوگوں کی طرف سے تو بے شک یہ عالمی سطح پر اُبھرے گا۔ابھی نہیں، ابھی تو ہم کام کریں گے اور چھوٹے پیمانے پر یہ کام پھیل جائے گا اور جب بہت سے اسکالرز کو خیال آئے گا کہ یہ کام اتنا اہم ہے تو وہ شاید اِس کو عالمی زبان میں تبدیل کریں، منتقل کریں، تب اُس وقت یہ چیز دنیا والوں کے سامنے آئے گی، میری یہ اُمید ہے۔تو میں یہ چند باتیں آپ کو اِس محفل میں بتانا مناسب سمجھتا ہوں اور آپ بھی یقیناً کام کی نوعیت کو، اِس کی اہمیت کو سمجھتے ہیں، تاہم یہ میرا فرض ہے کہ آپ کے استاد کی حیثیت سے مجھے صداقت پر مبنی مفید باتیں اور اہم باتیں بتانی چاہئے۔

اِس کے علاوہ میں آپ کو یہ مشورہ دیتا ہوں کہ آپ اِس موجودہ توجہ اور علم دوستی کے علاوہ ذاتی طور پر بھی کام کریں یعنی مطالعہ جو ہو سکے جاری رکھیں اور کچھ مقالے لکھنے کے لئے کوشش کریں اور علمی کام کریں، آپ باور کریں کہ بہت کم ہی عرصے میں آپ علمی طور پر مقالہ نویسی میں، مضمون نگاری میں کامیاب ہو سکتے ہیں اور اِس کے علاوہ اخیر میں میں آپ کو یہ بھی صلاح دوں گا کہ آپ عبادت بندگی اور ذکر کو اسی طرح ہی جاری رکھنا۔کیونکہ جب عبادت میں کمی واقع ہوتی ہے، جب ذکر میں سستی ہوتی ہے تو اُس کے ساتھ ساتھ ایک ایک چیز چھین لی جاتی ہے، خداوند جو چیزیں عبادت اور بندگی کے نتیجے میں عطا کرتا ہے اور اُس کے نہ کرنے کے ساتھ ساتھ بعض دفعہ وہ چیزیں واپس بھی لیتا ہے۔مثلاً ذوق، شوق، توفیق، ہمّت، دلچسپی ایسی چیزیں ہیں جو کہ یہ کم ہو سکتی ہیں اِس کے لئے اگر آپ کو راہِ مستقیم پر ثابت قدمی سے آگے بڑھنا ہے تو عبادت اور بندگی کو اور ذکر کو قائم رکھیں تا کہ مولا آپ کو اور زیادہ توفیقات سے نوازے اور آپ کو کامیابی عطا کرے۔مہربانی شکریہ آپ کا۔

<u>تین سو تیرہ (۳۱۳) مومنین</u> جو دُنیا میں ہوتے ہیں اُن کے بارے میں سوال کیا ہے کہ وہ کس خدمت کی بنیاد پر ہوتے ہیں۔یعنی اُن کو خداوند جو خصوصی درجہ عطا فرماتا ہے اُس کا سبب کیا ہے، اِن کی اِس میں نیکی کیا ہے، اُن کی فضیلت و مرتبت کیا ہے وغیرہ۔وہ چاہتے ہیں کہ اِس کا جواب دے دیا جائے۔چنانچہ اِس سلسلے میں عرض یہ ہے کہ اُن کی خدمت اُن کی فضیلت اور ریاضت و عبادت جو کچھ بھی ہے وہ زمانے کے تقاضے کے مطابق ہے، یعنی شروع سے لے کر اب تک خدمت کا معیار ہمیشہ ایک جیسا نہیں رہا ہے۔رسول اللہؐ کے

زمانے میں معاشرے کے لئے، قوم اور جماعت کے لئے، ملک وملّت کے لئے جن چیزوں کی ضرورت تھی اُن میں سے بہت سی چیزیں اب ایسی ہیں کہ اب اُن کی ضرورت نہیں ہے، اُن کی جگہ پر کچھ دُوسری چیزوں کی ضرورت ہے۔ دیکھا آپ نے کہ اِس سے معلوم ہوا کہ نیکی کا معیار ہر وقت بدلتا رہتا ہے خصوصاً خدمت کا معیار۔ اِس لحاظ سے زمانۂ قدیم میں جن خدمات کی بنیاد پر (۳۱۳) مومنین کا درجہ مرتّب ہوتا تھا وہ اب مختلف ہو سکتے ہیں، یعنی زمانے میں جس خدمت کی ضرورت ہے مذہب کے لئے، جماعت کے لئے، گروہِ مومنین کے لئے، اُس خدمت کے لحاظ سے ہوں گے وہ (۳۱۳) مومنین۔ بنیادی طور پر ایک تو اِس میں علم ہے اور ایک عبادت ہے لیکن عبادت کی کئی کئی شاخیں ہیں، بہترین عبادت خدمت ہے۔ جماعت کی خدمت، قوم کی خدمت، امامؑ کی خدمت، لیکن دیکھنا ہوگا کہ خدمت کونسی ہونی چاہئے اِس دور میں اِس زمانے میں، ظاہر ہے کہ اب وہ جہاد نہیں ہے جو زمانۂ رسولؐ میں تھا یعنی تلوار ہاتھ میں لے کے کافروں کو قتل کرنا ایسا جہاد اب نہیں ہے، یقیناً علمی جہاد ہے، یقیناً علمی جہاد ہے، علمی جنگ اب پہلے سے کہیں زیادہ ضروری ہے۔ اِس لئے اِس علمی جنگ میں خود کو علم کے ہتھیاروں سے لیس کرنا اور دُوسروں کو علم کے ہتھیاروں سے لیس کر دینا یہ ایک اہم خدمت ہے۔ چنانچہ امام حضرت مولانا سلطان محمد شاہ صلوت اللہ علیہ نے کسی ارشاد میں فرمایا ہے: ''کہ میں علمی ذوالفقار سے جنگ کروں گا یعنی علم کی تلوار سے میں جنگ کروں گا''۔ [کتاب: ہزار حکمت، ص:۶]

علم ایک ایسی تیز تلوار ہے کہ اِس کی مار بہت دُور دراز تک جاتی ہے اور یہ بہت زیادہ خون بہاتی ہے، خون شکوک وشبہات ہیں۔ یہ علم کی تلوار شیطان کے خلاف، نفس امّارہ کے خلاف اور دینی مخالفین کے خلاف استعمال ہوتی ہے۔ لہٰذا اِس کی بہت اہمیت ہے، وہ تلوار اگر ذوالفقار ہو یا کوئی اور وہ تلوار خواہ ذوالفقار ہو یا صمصام یا قمقام ہر حالت میں جو سامنے دشمن کھڑا ہے اُس کو مار سکتی ہے، یہ تلوار بہت دور دراز تک مار کر سکتی ہے۔ لہٰذا اِس جہاد میں جو بھی حصّہ لے گا اُس کو (۳۱۳) کا درجہ ملے گا اور آپ کو شاید تواریخی طور پر معلوم ہے کہ جنگِ بدر میں جو مسلمانوں کی طرف سے کافروں کے خلاف پہلی جنگ تھی (۳۱۳) مومنین تھے اور اُس میں مولانا علیؑ پہلی بار میدانِ کارزار میں آئے تھے۔ تو دیکھا وہ (۳۱۳) مومنین گو کہ وہ سب کے سب ایسے نہیں تھے جو (۳۱۳) کا درجہ ہے۔ بہر حال جو کچھ بھی تھے اُس گنتی کا اطلاق، اُس کا استعمال ایک جنگ سے متعلّق ہے۔ اِس سے معلوم ہوا کہ (۳۱۳) مومنین میں سب سے بڑی خوبی جو ہے وہ علمی جنگ ہے۔

علمی جنگ میں آپ کسی طرح سے بھی حصّہ لیں، خود ہی علم کے کارخانے میں کام کریں، تلواریں بنائیں یا تلواریں استعمال کریں یا تلواروں کو خریدیں معنی یہ کہ یا تو آپ علم کا کام خود کریں یا دُوسرں سے کرائیں یا خود سیکھیں اور دُوسروں کو سکھائیں یا سیکھنے اور سکھانے کے درمیان کوئی بھی کام کریں، کوئی بھی وسیلہ مہیّا کریں تو ہر حالت میں علمی جہاد ہوگیا۔ اب اِس کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ (۳۱۳) مومنین جو ہیں وہ سب کے سب افریقہ سے ہوں چونکہ یہ رُوحانی کام ہے تو کہیں بھی ہو سکتے ہیں اور کسی علاقے میں بہت زیادہ بھی ہو سکتے ہیں کسی میں کم بھی ہو سکتے ہیں اور بہر حال (۳۱۳) مومنین کی خصوصیات میں سے سب سے اہم اور پہلی خصوصیت علم ہے، یعنی علم کی خدمت میں حصّہ دار ہونا ہے کسی طرح سے بھی پھر دُوسری نیکیاں اور خوبیاں ہیں، اور ایک اور چیز یہ ہے کہ یہ ضروری نہیں ہے کہ (۳۱۳) مومنین جو ہیں اُن کو پتہ چلے کیونکہ بعض دفعہ جو رُوحانی مراتب ہیں اُن کا پتہ نہیں چلتا ہے معلوم نہیں ہوتا ہے اور اُن کو معلوم نہ

ہونے میں بھی مصلحت ہے فائدہ ہے۔ ہم گمان یہی کرتے ہیں کہ [وہ] اِس مرتبہ پر فائز ہو چکے ہیں لیکن یہ رُوحانی طور پر ہیں اور ایک اور بات ہے کہ یہ درجہ کچھ ظاہری نہیں ہے کہ اِس کے بارے میں اعلان ہو اور مولا کے حضور سے ٹائٹل آئے اور Paper پڑھا جائے یہ بات نہیں ہے یہ بالکل رُوحانی معاملہ ہے اس لئے یہ مرتبہ کسی کے پاس ہو سکتا ہے۔

ٹائپنگ: اکبر علی پروف: نسرین اکبر

استادِ بزرگوار علّامہ نصیر الدّین نصیرؔ ہونزائی (ق س) کا پُر حکمت بیان

Click here for Audio

عنوان: نیّت

کیسٹ نمبر: ۷   تاریخ: ۲۵/۱۱/۱۹۷۷، کراچی

اِس گریہ وزاری سے آپ سب صاف ہوئے تو نیت کریں کہ کچھ کچھ آپ کی رُوحانی طاقتیں میرے ساتھ شامل ہو جائیں اور آپ سب کی رُوحیں مجھ سے مل کر علم کے کچھ الفاظ ادا کرنے میں مدد کریں، یہ ناممکن نہیں ہے۔ میں نے کہا، میں نے عرض کی، میری گزارش یہ ہے کہ آپ سب نیّت کریں، کیونکہ نیّت بہت بڑی چیز ہے، کہ آپ سب کی رُوحیں مجھ سے مل کر علم کی کچھ باتیں کریں اور اسی نیت کی تمہید کے ساتھ ساتھ، نیّت کے ذکر کے ساتھ ساتھ ہم یہ چاہتے ہیں کہ نیّت کے بارے میں کچھ باتیں بتائیں کہ اسلام میں نیّت کی کیا اہمیت ہے اور نیّت کیا چیز ہے۔

میرے عزیزوں! دینِ اسلام میں نیّت کی بہت بڑی اہمیت ہے، بلکہ اِس کی اہمیت بنیادی قسم کی ہے۔ کیونکہ نیّت ہی اسلامی اعمال کی بنیاد ہے اِس کے معنی یہ ہیں کہ اسلام میں کوئی بھی عمل نیّت کے بغیر دُرست نہیں ہے۔ تو سب سے پہلے نیّت چاہئے، اگر اعمال کی تشبیہہ ایک عمارت سے دی جائے تو اِس اعمال کی عمارت کی بنیاد نیّت ہی قرار پائے گی۔ پیغمبرِ اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے اپنی مقدّس تعلیمات میں واضح الفاظ میں بھی اور اشاروں میں بھی نیّت کی بہت بڑی اہمیت بتائی ہے۔ کوئی عبادت، کوئی عمل، کوئی قول ایسا نہیں جس کا آغاز نیّت سے نہ ہوتا ہو، اگرچہ نیّت کے لئے لفظِ نیّت کے علاوہ بھی الفاظ استعمال ہوئے ہیں تاہم اسلام میں بنیادی چیز نیّت ہی ہے جس کی بہت بڑی اہمیت ہے۔ لہٰذا مومن کو یہ یاد رکھنا چاہئے کہ باطن کی اصلاح، اعمال کی درستی اور قول کی پاکیزگی کا آسان ترین طریقہ یہ ہے کہ سب سے پہلے نیّت کی درستی اور اُس کی اصلاح کی طرف زیادہ سے زیادہ توجہ دی جائے، اِس سے بڑھ کر نیّت کی اور کیا تعریف ہو کہ پیغمبرِ اکرمؐ نے ارشاد فرمایا ہے کہ إِنَّمَا الأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ اعمال دُرست ہونے یا نہ ہونے کا دارومدار نیّتوں پر ہے۔ (صحیح بخاری، حدیث نمبر ۱)

اِس کے معنی یہ ہوئے کہ اگر کوئی مسلمان بظاہر کوئی اچھا کام کرتا ہو لیکن اُس کی نیّت دُرست نہ ہو تو اُس کے اِس عمل کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ یہی سبب ہے کہ دُنیا میں ایسے اخراجات کرنے سے سختی کے ساتھ ممانعت کی گئی ہے جو نام ونمود کی خاطر کئے جاتے ہیں۔ کیونکہ ایسے اخراجات کے سلسلے میں نیک نیّتی کا سوال ہی نہیں ہوتا جب کہ اُن میں یہ نیّت ہوتی ہے کہ لوگ اُن کی تعریف کریں، اُس [شخص] کی عزّت کریں اور اُس کو بڑا آدمی سمجھیں، ظاہراً ایسے اخراجات، اگر کسی نیک کام کے سلسلے میں بھی

ہوں تاہم اُس میں نیّت کے نہ ہونے سے کوئی ثواب، کوئی فضیلت نہیں ہے۔ نیّت کی اہمیت کے سلسلے میں دانشمند مومن بہت سی مثالیں سمجھ سکتا ہے اور نیّت سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھا سکتا ہے۔

یاد رہے کہ نیّت دل کی کیفیت یا کہ ایک ارادہ اور خواہش کا نام ہے۔ سب سے پہلے نیّت ہوتی ہے اُس کے بعد قول ہے اور آخر میں عمل ہے یعنی کوئی بھی نیک کام، کام کی صورت میں آنے سے پیشتر قول کی شکل میں ہوتا ہے اور قول پہلے پہل نیّت کی صورت میں ہوتا ہے۔ اِس کی مثال ایک بیج کی طرح ہے، درخت کے ایک بیج کی طرح کہ سب سے پہلے بیج زمین کے اندر ہوتا ہے، بیج کا زمین کے اندر ہونا نیّت کی طرح ہے کہ وہ کس طرح مومن کے باطن میں پوشیدہ ہے، اِس کے بعد بیج اُگتا ہے اور ایک پودے کی شکل میں نمودار ہو جاتا ہے یہ قول کی طرح ہے کہ کس طرح ارادے سے یعنی نیّت سے قول کا ظہور ہوتا ہے۔ پھر اُس پودے میں پھل لگتا ہے یہ عمل کی مثال ہے کہ قول کے درخت میں عمل کا میوہ لگتا ہے۔ اب جس شخص کو اچھے پھل پیدا کرنے کی خواہش ہو تو اُسے چاہئے کہ ایک اچھا بیج، ایک اچھی گٹھلی کسی درخت کی زمین میں بوئے یعنی جس کو ایسے عمل کی ضرورت ہو جس سے زیادہ سے زیادہ ثواب حاصل ہو تو اُسے اچھی نیّت رکھنی چاہئے۔

نیّت وہ چیز ہے جس کی بدولت بعض عام اور معمولی چیزیں عبادت کی شکل اختیار کر لیتی ہیں اور جس کے نہ ہونے سے بعض افضل ترین عبادات بھی ناکام ہو کر رہ جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر حضرت امام سلطان محمد شاہ صلوات اللہ علیہ نے فرمایا کہ مومن اگر اِس نیّت سے سوتا ہے کہ خداوندا! مجھے صبح سویرے عبادت کے لئے جاگنا نصیب ہو تو اُس کی رات بھر کی نیند عبادت کی شکل و صورت اختیار کر لیتی ہے [''مومن رات کو سوتا ہے اُس وقت ایسا خیال کرتا ہے کہ میں صبح جلدی بیدار ہو کر اچھے کام کرونگا۔ مومن جب ایسے اچھے خیالات کر کے سوتا ہے تب اُس کا سونا بھی عبادت میں شمار ہوتا ہے'' زنجبار، ۱۳۔۹۔۱۸۹۹ء] ظاہر ہے کہ نیند عبادت نہیں ہے وہ ایک قسم کی موت ہے لیکن نیک نیّتی کی بدولت اُس کی ساری نیند عبادت و بندگی بن گئی۔ اسی طرح اگر ایک مومن کھانا اِس معنی میں اِس نیّت سے کھاتا ہے کہ اُس غذا سے جو بھی قوت حاصل ہوگی اُس سے فائدہ اٹھا کر وہ نیکی کرے گا اور خداوند کی غلامی کرے گا تو اُس کا کھانا پینا بھی عبادت ہے اور اگر وہ صحیح معنوں میں مومن ہے تو یہ بات ہو سکتی ہے۔ اب اسی طرح اور بھی بہت سے معمولی کام ہیں جو کہ عبادت میں نہیں ہیں، عبادت میں شمار نہیں ہیں مگر مومن کے ایمان اور اُس کی نیک نیّتی سے وہ سارے معمولی کام عبادت میں شُمار ہو جاتے ہیں۔ اِن مثالوں سے نیّت کی اہمیت اور اِس کی صلاحیت ظاہر ہو جاتی ہے۔

قرآنِ کریم میں نیّت کو صرف نیّت ہی کے نام سے یاد نہیں کیا گیا ہے بلکہ نیّت کو دل کی پرہیزگاری بھی کہا گیا ہے یعنی لفظ جو بھی ہو اُس سے دل کی نیّت مُراد ہے۔ آپ کو نیّت کے موضوع کے سلسلے میں قرآن کے اندر بہت سے مختلف الفاظ ملیں گے، لیکن اُن تمام کا مجموعی مطلب نیّت ہی ہوگا۔ آپ کو معلوم بھی ہے کہ اسلام کے اندر طہارت، نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج، جہاد وغیرہ یہ تمام عبادات نیّت کے بغیر نہیں ہیں، اِن تمام عبادات میں سب سے پہلے نیّت کی تعلیم دی گئی ہے۔ اِس لئے نیّت کے بارے میں

زیادہ خیال رکھنے کی ضرورت ہے، زیادہ توجہ کرنے کی ضرورت ہے یعنی مومن کو نیک نیّتی کی اہمیت جاننا چاہیئے۔

یہاں پر ایک اہم بات بتائی جاتی ہے وہ یہ کہ یاد رہے کہ انسان کے ظاہر سے باطن پر اثر پڑتا ہے اور باطن سے ظاہر پر اثر پڑتا ہے یعنی انسان کے دل میں اگر اچھی نیّت ہے تو اُس کا ظاہر پر اثر پڑتا ہے اور اگر بُری نیّت ہے تو اُس کا بھی اثر پڑتا ہے اور اسی طرح انسان کے ظاہری اعمال و اقوال سے اُس کے باطن پر اثر پڑتا ہے، اچھے اعمال و اقوال کا اچھا اثر پڑتا ہے اور بُرے اعمال و اقوال کا اثر بُرا پڑتا ہے۔ لیکن انسان ظاہر کو تو اچھی طرح سے دیکھتا ہے پالتا ہے لیکن باطن کو نہیں دیکھتا ہے کیونکہ باطن اُس کی نگاہوں سے پوشیدہ ہے یعنی اگر کسی کی زبان سے کوئی بُرا لفظ نکلتا ہے تو انسان خود بھی محسوس کرتا ہے اور دُوسرے لوگ بھی سمجھتے ہیں کہ اُس نے کیا کہا ہے، اِس صورت میں وہ ظاہر کی طرف سے اپنی حفاظت با آسانی کرسکتا ہے یعنی بُرائی سے خود کو بچا سکتا ہے کیونکہ بُرائی لوگوں کو بھی اچھی نہیں لگتی ہے اور خود اُس کو بھی کرنے کے باوجود اچھی نہیں لگتی ہے۔ لیکن باطن کا کام مشکل ہے اور باطن کا معاملہ کچھ ایسا ہے کہ ہر بار انسان لاپرواہی سے اپنے باطن کی خبر گیری نہیں کرتا ہے۔ جبکہ اس کو یہ اندیشہ نہیں ہوتا ہے کہ لوگ سنتے ہیں یا دیکھتے ہیں۔ لہٰذا وہ ٹال دیتا ہے اور نتیجہ کے طور پر رفتہ رفتہ اُس کے دل میں زنگ لگ جاتا ہے۔ اِس لئے قرآن میں باطن کو زیادہ سے زیادہ اہمیت دی ہے۔ قرآن نے کہا یُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ (۳:۲) غیب سے مُراد یہاں دل ہے، دل کی کیفیت لوگوں کی نگاہوں سے پوشیدہ ہے۔ چنانچہ خداوند نے فرمایا کہ وہ دل سے ایمان لاتے ہیں اور اسی قسم کے اور بھی الفاظ ہیں جن سے دل کی کیفیت مُراد ہے۔ تو ہوشمند مومن کو اِن باریک باتوں کے جاننے سے فائدہ ہوسکتا ہے اور مومن کو ہر وقت فائدہ حاصل کرنا چاہیئے۔ یہ بات نہ صرف دین شناسی میں شامل ہے بلکہ اِس میں خود شناسی اور خدا شناسی بھی ہے۔

ساتھ ہی ساتھ ہم دُرست اعمال کو بھی اِس کی بدولت انجام دے سکیں اور رُوحانی ترقی میں بھی کچھ قدم آگے بڑھ سکیں۔ لہٰذا مومن [کے لیے] اپنے دل کی نگہداشت اور حفاظت انتہائی ضروری امر ہے۔ اِس ضمن میں ایک اور مفید بات یہ بتانا ہے کہ کتابوں میں انسان کی اصلاح کے سلسلے میں ہزاروں قسم کی نصیحتیں آئی ہیں، اگر انسان اُن نصیحتوں کو سامنے رکھے تو ایک بہت بڑی دُنیا ہے، ایک بے پایان سمندر کہیں یا کہ ایک بہت عظیم جنگل سمجھیں۔ اب انسان اتنی ساری باتوں پر محیط نہیں ہوسکتا ہے، اُن تمام باتوں کو اپنے ذہن وضمیر میں جگہ نہیں دے سکتا ہے ایسی چیزیں ہیں یعنی اُن پر عمل پیرا ہونے کے لئے، پرہیزگاری کے لئے، خوش خلقی کے لئے، دین داری کے لئے، اُن تمام باتوں پر عمل کرنا پڑتا ہے۔ پس ہم کیوں نہ اپنے حواس کی نگرانی کریں یعنی ہم آنکھ کی نگرانی کریں، آنکھ کی حفاظت کریں بُری باتوں سے، بُری چیزوں سے کان کو روکیں، زبان کو ہاتھ پاؤں [کو] تو اِس طریقے سے مشکل کام ہمارے لئے آسان ہوگیا اور ہمارا منصوبہ محدود ہوکر ہم اُس پر حاوی ہوگئے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ آیا یہ منصوبہ اِس سے بھی زیادہ آسان اور مختصر ہوسکتا ہے یا نہیں، جب ہم نے سوچا تو اِس نتیجہ پر پہنچے کہ اعمال کا کہ منصوبہ اِس سے بھی زیادہ مختصر ہوسکتا ہے وہ یہ کہ ہم اپنی زبان کو روکیں، زبان کو روکیں تو دل بھی، آنکھ بھی رُکے گی اور کان بھی اور ہاتھ پاؤں سب کچھ لیکن! نہیں

اِس میں بھی آخری حد کی آسانی نہیں اِس سے بھی ایک زیادہ آسان طریقہ ہے وہ یہ کہ ہم دل کی حفاظت کریں کیونکہ دل سے ایک ایک راستہ آتا ہے آنکھ کو، کان کو، زبان کو، ہاتھ پاؤں کو اور تمام اعضاء و جوارح کو، دل سے راستے آتے ہیں ۔پس اگر ہم دل کی حفاظت کریں، دل کی نگرانی کریں، دل کو بُرائی سے بچائیں تو کام آسان ہوجائے گا، پھر بھی سوچتے ہیں کہ آیا ہر وقت ہم دل کی پاس داری کرسکتے ہیں، ہے تو کام آسان اُن تمام طریقوں سے یہ طریقہ بہت ہی آسان ہے جن کا ابھی ابھی ہم نے ذکر کیا۔تو بہر حال دل کی حفاظت، دل کی نگہداشت، دل کی پرہیزگاری آسان ہے اور جس سے مُراد نیّت ہے یعنی اگر ہم نیّت ہی کو لیں اُس کی حفاظت کریں، اُس کی اصلاح کریں، اُس کا خیال رکھیں، اُس کے آلودہ ہونے سے گریز کریں، اُس کو آلودہ نہ ہونے دیں تو کام آسان ہوگیا لیکن اِس میں ایک اور آسانی یہ ہے کہ دل کی صفائی اور نیّت کی دُرستی کا دارومدار اس بات پر ہے کہ وہاں بھی کوئی کلید ہے اور کلید یہ ہے کہ ہم یادِ مولا میں مصروف ہوجائیں۔

ہم نے نیّت کے بارے میں جو کچھ کہا وہ صحیح ہے وہ دُرست ہے اُس میں ذرا بھی غلطی نہیں ہے ذرا بھی شک نہیں ۔لیکن امکاناً آپ یہ سوال بھی کرسکتے تھے کہ نیک نیّتی کے لئے ہم کیا تدبیر اختیار کریں، آپ کہتے کہ ہم سمجھ تو گئے کہ نیک نیّتی بہت اچھی چیز ہے ہم نے مان لیا کہ وہ ایک درخت کے بیج کی مثال ہے، ہم نے یہ بھی مان لیا کہ وہ ایک عمارت کی بنیاد کی طرح ہے اور آپ یہ بھی بتائیں کہ ہمیشہ نیک نیّت ہونے کے لئے کیا چارۂ کار ہوسکتا ہے تو اسی کے لئے میں نے یہ وضاحت کی کہ یادِ مولا کو سینے سے لگا کر رکھا جائے یعنی ذکرِ خداوند کو تو بس سب مشکلات آسان ہوجائیں گی، نیّت خود بخود دُرست ہوگی، خود بخود دل کی پرہیزگاری ہوگی۔ کیونکہ ہر چیز کے اندر ایک تاثیر ہے، ہر تصوّر کا ایک نتیجہ ہے، کسی بُری چیز کے تصوّر سے بُرائی آتی ہے، کسی اچھی چیز کے تصوّر سے اچھائی آتی ہے۔

خدا کی یاد میں خدا کا تصوّر رہے خدا کے ذکر میں خوفِ خدا کا تصوّر رہے، ذکرِ الٰہی میں آخرت کا تصوّر رہے طبعی طور پر بھی اور معجزانہ طور پر بھی، اِن دونوں لفظوں کا کیا مطلب ہے جو میں نے کہا کہ طبعی طور بھی اور معجزانہ طور پر بھی ۔طبعی طور پر کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ظاہری اُصول کے مطابق، عام عادت کے مطابق، انسان کی فطرت کے مطابق جو کچھ ہوتا ہے وہ طبعی طور پر ہے، وہ Nature ہے اور معجزانہ طور پر کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اُس یادِ الٰہی میں ایک معجزہ بھی ہے، وہ طبیعت سے ماورا ہے، وہ قدرتی تاثیر ہے، ایک عام تاثیر ہے ایک قدرتی تاثیر ہے۔ یادِ الٰہی کی عام تاثیر پر بھی آپ سوچیں اور معجزانہ تاثیر پر بھی آپ سوچیں ۔آپ کے خیال میں پہلے معجزانہ تاثیر اور بعد میں فطری تاثیر آنی چاہئے، نہیں، پہلے عام چیز آتی ہے معمولی چیز آتی ہے اُس کے بعد خاص چیز اور اعلیٰ چیز آتی ہے ۔لہٰذا اگر آپ ذکرِ الٰہی سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں تو سب سے پہلے آپ اُس کے عام پھل کی توقع رکھیں۔ عام پھل، معمولی فائدہ طبعی طور پر اُسکی جو تاثیر ہے، پھر اُس کے بعد اُس کی معجزانہ تاثیر کی توقع رکھیں ۔ایک شخص اپنے باپ کو بار بار یاد کرتا ہے، تو اِس یاد کے سلسلے میں باپ سے متعلّق سب چیزیں اُس کے ذہن میں آئیں گی، باپ نے کیا کہا تھا، باپ کیسا تھا، باپ اچھا تھا یا

بُرا تھا، اُس نے کبھی مہربانی کی تھی یا کبھی غصّہ کیا تھا سب چیزیں اِس ایک یاد سے منسلک ہو کر یاد آنے لگیں گی، یہ فطری بات ہے۔ چنانچہ اگر کوئی شخص خداوند کو یاد کرتا ہے، خدا کے مبارک اسم کو پڑھتا ہے، اُس کا ذکر کرتا ہے، اُس کا ورد کرتا تو نتیجۃً خدا کی چیزیں اُس کے ذہن وضمیر میں رفتہ رفتہ بھر جائیں گی۔ اگر کثرت سے یاد کرے تو بہت ممکن ہے کہ ایک دن وہ خود کو خدا کہے۔ اِس کی وجہ یہ ہوگی کہ رفتہ رفتہ خدا کی عادتیں، خدا کی صفات، خدا کی مہربانیاں، خدا کی رحمتیں اُس کی ہستی میں بھر جائیں گی۔ اُس کی اپنی خودی رفتہ رفتہ کم سے کمتر ہوتی چلی جائے گی اور یہ خدا میں فنا ہو جائے گا اِس یادِ الٰہی کے نتیجے میں۔

میں نیک نیّتی کے سلسلے میں کہہ رہا تھا کہ اگر ہم کو نیّت کی اہمیت معلوم ہے اور ہم چاہتے بھی ہیں کہ نیّت اچھی ہو، دل کی کیفیت اچھی ہو، گناہ سے بچنے کا بنیادی علاج بس یہی ہے کہ ہم دل کی حفاظت کریں، دل کا تقویٰ اختیار کریں تو اُس کے لئے یہی طریقہ ہے۔ پہلے مرحلے پر ہم صرف نیّت کی اہمیت پر بات کرتے تھے اور ہم سب نے مان لیا تھا کہ واقعۃً نیّت بہت بڑی اہم چیز ہے۔ تو گفتگو کے دُوسرے مرحلے پر ہم نے یہ بتایا کہ اچھی نیّت ہو اُس کا کیا علاج ہے ہم نے یہ بحث چھیڑی اور اُس سلسلے میں ہم نے کہا کہ دونوں جہاں میں ایک حقیقت ہے اور اُس حقیقت کا نام خدا ہے اُس کا تصوّر، اُس کی یاد، اُس کی محبت، اُس کا کام، اُس کی فکر، اُس کا خیال اور اُس کے امر وفرمان کے مطابق کام یہ سب یاد ہے۔ بہت سی یادیں ہیں سب یادیں ملا کر ایک یاد ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر وقت یعنی خداوند کے اسم کو یاد کریں، کوئی نیک سے نیک کام کریں وہ بھی یادِ الٰہی ہے وہ کام بھی آپ یادِ الٰہی میں کرتے ہیں، اچھا کام نیک نیّتی سے، کوئی نیکی کریں، کوئی امر بجالائیں، کوئی فرض ادا کریں، کوئی حق ادا کریں، کوئی خدمت کریں تو رفتہ رفتہ اُس کا کوئی پھل ہوگا اور وہ پھل اِس طرح سے ہوگا کہ اگر یادِ الٰہی بہت اچھا پھل ہے تو وہی آپ کو ملے گا ، اسی کی طرف آپ کی توجہ دلائی جائے گی۔

تو میں کہہ رہا تھا کہ یادِ الٰہی میں بہت سی عمدہ چیزیں ہیں، بہت اعلیٰ حقیقتیں ہیں اور یادِ الٰہی میں سب سے بڑھ کر نور ہے، وہ نورِ ہدایت کا نور ہے، میں نے بالکل اچھی طرح سے آپ کو یہ تصوّر دیا ہے کہ یادِ الٰہی کے دو نتائج ہیں ایک طبعی نتیجہ ہے جس کو ہر انسان سمجھ سکتا ہے ایک معجزانہ نتیجہ ہے اور اُس کے معجزانہ نتیجے کے طور پر آپ کو نورِ ہدایت ملے گا ''توفیق'' جسے کہتے ہیں اور ''ہمت'' جسے کہتے ہیں، ''حوصلہ'' جسے کہتے ہیں، ''وحی'' جسے کہتے ہیں، ''القاء'' جسے کہتے ہیں، ''الہام'' جسے کہتے ہیں اور اسی طرح سے دل کی نیّت، دل کی پاکیزگی، دل کا تقویٰ حاصل ہو سکے گا۔ مومن کو اگر رُوحانی ترقی کا خیال ہے تو اُسے اِس ترقی کے لئے کورس کرنا پڑے گا، دُنیا کے اندر کوئی فن ایسا نہیں ہے جس کے لئے سکھلائی کی ضرورت نہ ہو، کوئی پیشہ ایسا نہیں ہے اور عام سے عام پیشہ بھی تعلیم چاہتا ہے، علم کے مطابق ہر چیز، ہر فن، کچھ پیشے ایسے ہیں وہ دیکھا دیکھی کرتے ہیں لوگ خیال کرتے ہیں کہ اِس پیشے کے لئے علم کی ضرورت نہیں ہے، تعلیم کی ضرورت نہیں ہے، حالانکہ اُس میں بھی تعلیم دی گئی، تعلیم حاصل کی گئی کہ اُن لوگوں نے جنہوں نے یہ پیشہ اپنے گھر والوں سے یا کسی استاد سے حاصل کیا، انہوں نے دیکھ دیکھ کر آنکھوں کی راہ سے تعلیم پائی یا عملی طور پر انہوں

نے تعلیم پائی یا سیکھا۔ تو بہر حال کوئی چیز ایسی نہیں ہے، کوئی ہنر ایسا نہیں ہے، کوئی پیشہ ایسا نہیں ہے جس کے لئے تعلیم اور سکھلائی کی ضرورت نہ ہو، پس رُوحانی ترقی تعلیم کے بغیر کس طرح کی جا سکتی ہے جو مشکل کام ہے اور بہت ہی باریک ہے۔

لہٰذا اعمال کی اِن باریکیوں کو سمجھے بغیر، دل کی کیفیت کو سمجھے بغیر، دل کے فلسفے کو سمجھے بغیر۔ دل ہی سب کچھ ہے، ہماری اِس ہستی کے اندر جو اہم پُرزہ ہے اِس مشینری کے اندر وہ دل ہے تو دل کی کیفیت کو، دل کی عادت کو، دل کے Action کو سمجھنا چاہئے اور ہمیں یہ سمجھنا چاہئے کہ کس طرح ہم اپنے دل کے تقویٰ کو اِس کی پرہیزگاری کو حاصل کر سکتے ہیں یہ ہے، تو دیکھا یہ سب باتیں جا جا کر، یہ تمام نصیحتیں جا جا کر ذکرِ الٰہی میں، گریہ وزاری میں سمٹ کر محدود ہو گئیں، تو اِس لئے اکثر ہم یہ کوشش کرتے ہیں کہ مجلس میں تھوڑی سی گریہ وزاری سے دل کی صفائی ہو، کیونکہ اِس سے جیسا کہ میں نے اپنے لیکچر کے دوران یہ بھی کہا کہ بعض دفعہ اثر ظاہر سے باطن کی طرف پڑتا ہے اور بعض دفعہ باطن سے ظاہر پر اثر پڑتا ہے، یعنی گریہ وزاری ایک ظاہری چیز ہے لیکن اِس کا اثر ہمارے ظاہر سے ہمارے باطن پر پڑتا ہے پھر ہی دل کی بھی صفائی ہوتی ہے، پھر ہم بات بھی اچھی طرح سے سن سکتے ہیں اور بات بھی اچھی طرح سے کر سکتے ہیں اِس کے لئے گریہ وزاری کی اہمیت ہے۔

تو بہر حال ہم نے دل کے تقویٰ اور نیّت کے سلسلے میں چند اہم اور بنیادی باتیں بتائیں، اگر آپ اِن باتوں پر غور کریں، اِن کی طرف توجہ دیں تو اِس موضوع سے متعلّق جتنی اہم باتیں ہیں اُن کو آپ یقیناً خود بخود سمجھ سکتے ہیں یا یہ کہ اِس گفتگو سے، اِس لیکچر سے، اِس تقریر سے آپ بہت سی مفید باتیں خود بخود سمجھ سکتے ہیں غور و فکر کے نتیجے میں اور ایک چیز کے سمجھنے سے بہت سی چیزیں سمجھ میں آتی ہیں انسان کی عقل کے اندر یہ صلاحیت ہے اور خصوصاً مومن کو یہ توفیق ملی ہے کہ وہ جب کچھ بنیادی باتیں سمجھ لیتا ہے تو فروعی باتیں بہت ساری سمجھ لیتا ہے، میں یہ چاہتا تھا کہ آپ عزیزوں کو ایسی چند باتیں بتاؤں۔

بہر حال اب ہم اپنی گفتگو کو ختم کریں گے اور ختم ہونے سے پیشتر دُعا کے الفاظ میں دُعا مانگتے ہیں کہ خداوندِ عالمین اپنی بے پناہ رحمت سے آپ سب پر مہربانیوں اور رحمتوں کی نوازش، خوشیوں کی بارش برسائے اور آپ سب کی نیک مُرادوں کی تکمیل فرمائے، آپ کی کوئی مشکل مشکل نہ رہے آسان ہو جائے، آپ کی سب بلائیں رد ہو جائیں، دُور ہو جائیں، آپ کو خداوند دونوں جہان کی کامیابی عطا فرمائے اور آپ نے اِس مجلس میں حاضری دینے کے سلسلے میں جو محنت مشقّت اُٹھائی تھی اِس کے عوض میں ہزار ہزار نیکیاں مولا آپ کو عطا کرے، آپ شاد و خرّم رہیں، آپ سے مولا ہمیشہ راضی رہے اور آپ کو خداوند کی دوستی اور اُس کی حقیقی محبّت حاصل ہو، آپ کو خداوند نورانی دیدار سے نوازے، آپ کو علم کی دولت سے مالا مال کرے اور آپ کو حقیقی دیدار سے ظاہر میں بھی باطن میں بھی نوازے، آمین! یاربّ العالمین!! مہربانی، شکریہ۔

آپ کا سوال ہے کہ ''امام سلطان محمد شاہ صلوات اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ مجھے زندگی میں کبھی خواب نہیں آیا'' اور آپ پوچھتے ہیں کہ اِس کی کیا وجہ ہے اور کیسے امامؑ کو خواب نہیں آیا؟ تو اِس سلسلے میں گزارش ہے کہ انسانِ کامل جس سے مُراد پیغمبرؐ اور امامؑ

ہیں کو خواب نہیں آتا ہے، کیونکہ خواب ایک طرح کی موت ہے اور انسانِ کامل اِس جزوی موت سے بالاو برتر ہیں اُس کو خواب نہیں آتا ہے تو پھر کیا ہوتا ہے کہ وہ سکون کرتے ہیں اگر اُن کی ظاہری آنکھ سوتی ہے تو اُن کے دل کی آنکھ نہیں سوتی ہے وہ بیدار ہوتے ہیں اور سکون فرماتے ہیں، سکون کرتے ہیں، بظاہر وہ سوئے ہوئے نظر آتے ہیں لیکن وہ سوتے نہیں ہیں۔ اِس سلسلے میں کئی دلائل موجود ہیں، ایک یہ کہ رسول اللہؐ نے بھی اپنے متعلق ارشاد فرمایا ہے کہ: [تَنَامُ عَيْنَايَ وَلَا يَنَامُ قَلْبِي، میری آنکھ سوتی ہے لیکن میرا دل نہیں سوتا ہے۔ صحیح بخاری، حدیث نمبر ۳۵۶۹] یہ خود انسانِ کامل کی طرف سے ایک ثبوت ہے اور اِس کے علاوہ میں ایک دو باتیں اِس کائنات سے پیش کروں گا کہ دنیا کے اندر جن جانوروں کو نیند کی ضرورت ہے، ہم اُن جانوروں کو ایک جیسے نہیں پاتے ہیں نیند کے معاملے میں، کچھ جانور ہیں جو بہت زیادہ سوتے ہیں، کچھ جانور ہیں جو نہیں سوتے ہیں اور میں نے یہ بحث جانوروں کی نیند یا کہ اُن کے سونے کے سلسلے میں اِس لئے چھیڑی کہ نیند جسم کی ایک ضرورت ہے آپ کے ہمارے سب کے نزدیک، لیکن اِس ضرورت کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے جانور رات بھر اور دن کو بھی نہیں سوتے ہیں لیکن کچھ جانور ہیں جو سخت گہری نیند میں سوتے ہیں اور مشہور ہے کہ خرگوش بہت زیادہ سوتا ہے اِس لئے کہا جاتا ہے کہ خوابِ خرگوش، یہ محاورہ مشہور ہے خوابِ خرگوش میں سوئے تھے وغیرہ لیکن آپ نے کبھی پرندوں پر سوچا ہے کہ وہ درخت کی ٹہنیوں پر بسیرا لیتے ہیں اور پنجے سے ایک نازک ٹہنی کو پکڑے ہوئے ہوتے ہیں آپ باور کریں گے کہ وہ اِس نیند میں نہیں سوتے ہیں جس نیند میں ایک بچہ سوتا ہے، بچے کو آپ مٹھائی پکڑائیں یا بسکٹ یا کھلونا اور سلائیں ظاہر ہے کہ جیسے ہی نیند آئے گی اُس کی گرفت سے وہ کھلونا جو ہے وہ آزاد ہو جائے گا وہ مٹھائی کو یا بسکٹ کو پکڑ نہیں سکے گا نیند کی حالت میں، لیکن یہ کیا وجہ ہے کہ پرندہ سوتے ہوئے بھی اپنے پنجے سے درخت کی ٹہنی کو پکڑ رہا ہے ظاہر ہے کہ یعنی بچہ جس نیند میں سوتا ہے پرندہ اُس نیند میں نہیں سوتا ہے یہ دیکھا آپ نے فرق، گھوڑے [کے متعلق] آپ نے کبھی سوچا ہوگا چاروں پاؤں پر وہ رات بھر کھڑا رہتا ہے اور دن میں تو کام کرتا ہے، آپ نے کہاں دیکھا کہ گھوڑا سوتا ہے، نہیں سوتا ہے اور اگر سوتا بھی ہے تو اِس طرح سے نہیں جو آدمی سوتا ہے۔

ایک اور چیز کو لیں چمگادڑ ایک پرندہ ہے اُس کے جسم میں خصوصاً پاؤں میں ہڈیاں نہیں ہیں لہٰذا دُوسرے پرندوں کی طرح وہ سیدھا بسیرا نہیں لے سکتا ہے یعنی وہ خود کو اُلٹا لٹکاتا ہے اور اپنے چنگ [پنجے] سے کسی چیز کو یا درخت کی شاخ کو پکڑ کر خود کو لٹکاتا ہے یا کسی مکان کی سیلنگ میں خود کو لٹکاتا ہے کون کہہ سکتا ہے کہ وہ سوتا ہے وہ آدمی کی طرح سوئے تو وہ گر پڑے، یہ دن کی کیفیت ہے اُس کی اور رات کے وقت وہ اُڑتا ہے تو پھر وہ کہاں سوتا ہے، تو یہ جانوروں کی مثالیں ہوئیں آپ سوچیں آپ کو اِس قسم کی مثالیں بہت ملیں گی جن سے آپ باآسانی اندازہ کر سکیں گے کہ جسم کی مرمّت کے لئے اگر نیند کی ضرورت ہے تو پھر اِس معاملے میں سب جانور ایک جیسے نہیں ہیں۔ اچھا اب آئیں انسان کی نیند پر، ایک بوڑھے کی نیند، ایک بچے کی نیند، ایک جوان کی نیند، بیمار آدمی کی نیند اور بیماری سے صحت یاب ہونے کے وقت جو نیند آتی ہے وہ نیند، ایک شرابی کی نیند، ایک مسافر کی نیند اور

ایک چوکیدار کی نیند، ایک چوکیدار ایسی نیند میں نہیں سوتا ہے جو سیٹھ سوتا ہے سیٹھ تو بڑے آرام سے سوتا ہے اور سیٹھوں میں بھی بڑا فرق ہیں جن سیٹھوں کو یہ خدشہ ہو کہ کوئی ڈاکو آئے گا، چور گھسے گا، چھُرا گھونپے گا وغیرہ۔ تو اُن کو کہاں نیند آتی ہے تو نیند کے معاملے میں ہم نے آدمی کو مختلف پایا۔ اِس کے علاوہ ایک بھگت کی نیند، ایک پرہیز گار کی نیند کہ وہ لمحہ لمحہ جاگتا ہے اور جب مسافر ایسی جگہ پر ہوتا ہے جہاں پر خطرہ ہے تو اُس کو نیند نہیں آتی ہے اور اس شخص کو بھی نیند نہیں آتی ہے جس [کے پاس] سونے کا ایک خزانہ ہے یا سونے کی ایک ڈَلی ہے یا بہت کچھ اُس کے پاس رُوپے پیسے ہیں، وہ کہیں بیابان میں یا ریل گاڑی میں کہیں جا رہا ہے تو وہ اُس سرمائے کو یاد کرتا ہے اُن پیسوں کو یاد کرتا ہے پھر اُس کی نیند حرام ہو جاتی ہے اور اسی طرح ایک ایسا شخص، جس کو کسی چیز سے محبّت ہے تو اُس کو بھی نیند نہیں آتی ہے، اِن مثالوں سے اب ہم قریب آ گئے کہ انسانِ کامل کو سمجھیں تو انسانِ کامل کی نیند نہیں ہے اور جس کو کچھ رُوحانیّت کا تجربہ ہو، جو کثرت سے ذکر کرتا ہو، تو اس کی نیند کم ہو جاتی ہے۔

ٹائپنگ: اکبر علی پروف: نسرین اکبر

استادِ بزرگوار علّامہ نصیر الدّین نصیرؔ ہونزائی ؒ کا پُرحکمت بیان

عنوان: عذاب کی حقیقت

کیسٹ نمبر: ۸۔اے   تاریخ: ۱۹۷۷، کراچی

Click here for Audio

حصولِ علم کے لئے جدو جہد لازمی شئ ہے، مومن کا اِس دُنیا میں آنا بہت بڑی اہمیت رکھتا ہے، مومن کا اِس سیّارۂ زمین پر آنا بہت معنی رکھتا ہے، مومن کے اِس جہان میں آنے کے بہت سے مقاصد ہیں اور اُن میں سے ایک مقصدِ اعلیٰ ہے۔ [یہ] نہ سمجھا جائے کہ دُنیا میں مومن کے آنے کا ایک ہی مقصد ہے، بہت سے مقاصد ہیں، بہت سے مقاصد ہیں، یہاں اِس دُنیوی زندگی گزارنے میں بہت سی حکمتیں ہیں اور مومن کی زندگی کے مقاصد میں سے ایک عظیم مقصد حصولِ علم ہے یعنی علم حاصل کرنا۔ علم حاصل کرنا ایک مقدّس فریضہ ہے، علم حاصل کرنا مومن کی ایک اہم ذمہ داری ہے اور جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ علم ایک دولت ہے، بہت ہی عظیم دولت جو لافنا اور لازوال ہے۔ جس طرح مادّی دولت کے حصول کے مختلف طریقے ہوا کرتے ہیں کہ کسی کو کس طرح دولت ملتی ہے اور کوئی کس طرح دولت حاصل کرتا ہے۔ اسی طرح علم کی دولت کمانے کے بھی الگ الگ طریقے ہیں لیکن سب سے آسان طریقہ علم کی دولت حاصل کرنے کا یہی ہے کہ مومن علمِ لدّنی کے قریب ہو جائے اور اسی سے فیض حاصل کرے۔

اِس کی مثال ایسی ہے جیسے دنیوی دولت کے سلسلے میں کسی کو کوئی خزانہ ملتا ہے۔ خداوندِ عالم نے اِس سلسلے میں ایک ارشاد فرمایا ہے اور وہ ارشاد حدیثِ قدسی کے عنوان سے ہے کہ: [كُنْتُ كَنْزاً مَخْفِيّاً فَاَحْبَبْتُ اَنْ اُعْرَفَ فَخَلَقْتُ الْخَلْقَ لِكَيْ اُعْرَفَ ، میں ایک چھپا ہوا خزانہ تھا اور میں نے چاہا کہ پہچانا جاؤں تو اِس کے لئے میں نے مخلوق کو پیدا کیا تا کہ میری پہچان ہو کتاب: احادیثِ مثنوی، ص ۲۹]۔ اِس حدیثِ قدسی کا خلاصہ یہ ہے کہ خداوند نے اپنے پاک نور کو رُوحانی دولت کا خزانہ قرار دیا ہے۔ اِس اشارے کے اندر بہت سی، بہت سی حکمتیں پوشیدہ ہیں جن کو ہوشمند کے بغیر کوئی نہیں سمجھتا، کیونکہ خداوندِ عالم نے اپنی ذات و صفات کو ایک خزانے سے تشبیہہ دی ہے، اور اِس کی وضاحت دُنیوی خزانے کی مثال سے ہوسکتی ہے اور وہ یہ کہ اِس دُنیا کے اندر اگر کسی کو کوئی خزانہ مل جاتا ہے تو وہ رفتہ رفتہ نہیں ملتا بلکہ یکایک مل جاتا ہے اور اِس میں دُوسری بات یہ ہے کہ جس کو خزانہ مل جاتا ہے وہ یکایک امیر بن جاتا ہے، جس کو خزانہ ملتا ہے وہ گویا بادشاہ بن جاتا ہے، جس کو ایک عظیم خزانہ مل جاتا ہے اُس کو سب کچھ مل جاتا ہے اور خصوصاً جس کو خداوندی کا خزانہ، اُس کی صفات و ذات کا خزانہ مل جائے تو پھر اُس کا کیا کہنا اور <u>ایک خاص بات اِس میں یہ ہے کہ معرفت کے اعلیٰ مقام پر خدا اپنے نور کو عقل و رُوح کا خزانہ قرار دے</u> کر حقیقی مومن کے سپرد کر دیتا ہے، تو اِس

میں کتنی رحمت ہے اور کیسی عظیم مہربانی ہے کہ پروردگارِ عالم ایک خاموش خزانے کی طرح اپنے آپ کو مومن کے حوالے کر دیتا ہے، علم میں رحمت کی اِس سے بڑھ کر کوئی مثال نہیں کہ خدا اپنے آپ کو لازوال اور غیر فانی خزانہ بنا کر مومن کے حوالے کر دیتا ہے، کوئی دانشمند تصوّر ہی نہیں کر سکتا ہے کہ اِس خدائی خزانے سے باہر بھی کوئی دولت ہے، جہاں پر اللہ تعالیٰ ایک خزانے کی حیثیت سے ہے وہاں پر دونوں جہان کی سلطنت اور ہر قسم کی نعمت موجود ہے اور ابدی نجات بھی یہی ہے کہ حقیقی مومن اُس خزانے کو پائے۔ یہ خزانہ ختم نہ ہونے والا اور عقل و جان کی دولت سے مالا مال ہے۔ خداوندِ عالم کی رحمتوں اور مہربانیوں کی اِس سے بڑھ کر کوئی مثال نہیں ملتی کہ خدا نے اپنے مومن کو یہ درجہ عنایت فرمایا اور اُس کو یہ مقام دیا جہاں پر کہ وہ خدا کو اپنے تصرّف کے ایک خزانے کی حیثیت سے حاصل کر لیتا ہے۔ خداوندِ عالمین مومنین کو اِس مقامِ عالی کی طرف بڑھنے کے لئے توفیق اور ہمّت عنایت فرمائے۔ آمین! یاربَّ العالمین!!۔

ہم اُسی چیز کو معرفت بھی کہہ سکتے ہیں اور جیسا کہ آپ جانتے ہیں اسلام کی تشبیہہ جہاں ایک راستے سے دی گئی ہے وہاں اُس راستے کی چار منزلیں ہیں، ابتدائی منزل شریعت ہے، دُوسری منزل طریقت، تیسری حقیقت ہے اور آخری منزل معرفت ہے جو چوتھی منزل ہے۔ تو اسی طرح علوم بھی درجہ بدرجہ ہیں تو اِس راستے کی مثال میں جو علم سب سے آخری ہو، سب سے اعلیٰ ہو اُس کا تعلق معرفت سے ہوگا اور وہ معرفت کی طرح انتہائی اور آخری علم ہوگا۔ پس جو علوم شریعت کے برابر ہیں یا شریعت کے ساتھ ساتھ ہیں اُن کی اہمیت بھی اتنی ہی ہے اور جو علوم طریقت سے متعلّق ہیں اُن کی حیثیت دُوسرے درجے کی ہے اور جو علوم حقیقت سے متعلّق ہیں وہ چوتھے درجے سے تعلق رکھتے ہیں اور جو علوم حقیقت کے بارے میں ہوں وہ آخری ہیں۔ پس ہمارے کہنے کے مطابق سب سے اعلیٰ اور سب سے برتر علم جس کے تحت دُوسرے سب علوم آتے ہوں وہ معرفت ہے یعنی خدائی علم۔ اگر اسماعیلی مذہب کی کوئی تعریف ہے تو وہ بھی اسی بنیاد پر ہے کہ یہ مذہب معرفت [کا مذہب ہے]۔ تو آپ کو اسماعیلی مذہب کی اہمیت اور اِس کی فضیلت و مرتبت کا یقین آسکتا ہے، ورنہ ظاہری طور پر کوئی نہیں سمجھتا ہے کہ اسماعیلیت کا یہ مقام ہے۔

میں نے اپنی اس گفتگو میں آپ کو یہ ثبوت پیش کیا کہ اسماعیلی مذہب کا جو مقام ہے وہ خدا شناسی کے اعتبار سے اعلیٰ ہے۔ اسی طرح جو مضمون سب سے اُونچا ہو وہ دُوسرے تمام مضامین پر محیط ہوگا اور اِس مضمون سے متعلّق علم کے جاننے سے دُوسرے علوم کی جھلکیاں بھی اِس میں سے نظر آئیں گی۔ جس طرح کہ ایک عزیز اسٹوڈنٹ نے مجھ سے کہا کہ ''سر آپ نے سائنس پڑھی ہے؟'' میں نے کہا کہ نہیں، انہوں نے کہا کہ آپ کے مضامین میں تو سائنس کی باتیں بھی بہت آتی ہیں، میں نے کہا کہ سائنس ایک علم ہے اور ذیلی علم ہے وہ دین کے اعلیٰ علم کے تحت آتا ہے، تو جنرل سائنس کی باتیں دینی علم کے ضمن میں آتی ہیں، اِس لئے خداوند کی مہربانی اور حکمت ہے کہ اُس پروردگارِ بے نیاز نے، اُس قادرِ مطلق نے انبیاء و اولیاء کو جو علم عطا کیا تھا اُس کی روشنی میں وہ حضرات بہت سے علوم کی باتیں جانتے تھے۔ بعض دفعہ جو ہوشمند افراد ہیں وہ سوال کرتے ہیں کہ کیا علم کبھی ختم بھی

ہوجاتا ہے یا نہیں؟ تو اِس کا جواب دو طرح سے دیا جاسکتا ہے وہ یہ کہ علم ایک لحاظ سے کبھی ختم نہیں ہوتا ہے اور پھر دُوسرے لحاظ سے وہ ختم ہوجاتا ہے اور اِس مطلب کی تفصیل یہ ہے کہ علم کی مثال ایک عظیم سمندر کی طرح ہے اور اگر اُس علم کے سمندر کی گہرائی میں جانا ہے، اُس کی مقدار کو دیکھنا ہے اور اُس کے اندر ڈوبنا ہے تو پھر وہ کبھی ختم نہیں ہوتا اور اگر سطحِ سمندر پر کسی جہاز کے ذریعے سے اِس کنارے سے اُس کنارے تک جانا ہے اور سمندر کو استعمال کرتے ہوئے ساحلِ مُراد تک پہنچنا ہے تو پھر سمندر اِس صورت میں ختم ہی ہوجاتا ہے، یعنی اگر علم ہی میں گُم ہوجانا ہے، علم ہی سے غرض ہے اور اُسی میں ڈوب جانا ہے تو وہ کبھی ختم نہیں ہوتا ہے اور اگر علم کے راستے سے گزر کر خدا تک پہنچ جانا ہے، خدا کو پانا ہے، اُس کی شناخت حاصل کرنی ہے اور اِس سلسلے میں ضروری باتیں سمجھنی ہیں تو اُس وقت ضروری علم ختم ہوجاتا ہے۔ یہ اِس سوال کا بہترین جواب ہے جس کے دو رُخ ہیں۔

اب میں نے جو کہا اُس کا ثبوت، آپ سب عزیزان جانتے ہیں کہ خدا کی شناخت ممکن ہے، اسلام کے اندر خدا کی معرفت ایک اصطلاح ہے، ایک موضوع ہے اور یہ لفظ بار بار آتا ہے، اِس سے یقین آتا ہے کہ خدا کا قُرب حاصل ہوجاتا ہے۔ یہاں تک کہ اہلِ طریقت بھی اِس حقیقت کو مان لیتے ہیں کہ انسان اپنے آپ کو یعنی اپنی خودی کو خدا کے نور میں فنا کرسکتا ہے، جس کو کہتے ہیں کہ ''فنافی اللہ وبقا باللہ''۔ اب اگر ہم اِس حقیقت کو تسلیم کرلیں تو اِس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ خدا علم کے اُس پار ہے یا کہ خدا علم کے اُوپر ہے اور اگر آپ خدا تک پہنچتے ہیں تو علم سے گزر کر خدا تک پہنچتے ہیں۔ ایسا تو نہیں ہوسکتا ہے کہ آپ خدا تک پہنچ جاتے ہیں پر علم کو سَر نہیں کرسکتے ہیں اور اگر یہ تصوّر کیا جائے تو اِس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ علم خدا سے برتر ہے یعنی جس اونچے درجے پر خدا ہے اگر آپ اُس درجے تک پہنچ جاتے ہیں تو ماننا پڑے گا کہ علم سے آپ اُوپر گئے۔ کیونکہ علم خدا سے کچھ اُوپر تو نہیں ہے، علم تو خدا کی شناخت کے نیچے ہے۔ اِس سے میرے اِس عمدہ جواب کی تصدیق ہوگئی کہ میں نے جو کہا تھا وہ صحیح ہے اور وہ یہ ہے کہ ایک لحاظ سے علم ختم ہوجاتا ہے اور ایک لحاظ سے علم ختم نہیں ہوتا ہے۔ اگر آپ کو یا کسی کو علم ہی میں گم ہوجانا ہے، علم کے جنگل میں پھنسنا ہے، اُسی کو ناپنا ہے، اُسی کو تولنا ہے اور اُسی میں مستغرق رہنا ہے اور آگے نہیں بڑھنا ہے بس اُسی میں چلنا ہے، پھرنا ہے، اِس طرف اُس طرف اور ہر سمت کو چلتے گھومتے رہنا ہے تو علم کبھی ختم نہیں ہوتا ہے۔

اگر آپ کا مقصد علم سے یہ ہے کہ اُس کو استعمال کرکے آگے سے آگے بڑھیں اور Direct خدا کو پہنچیں تو اُس وقت علم ختم ہوجاتا ہے۔ گو کہ علم کی تفصیلات میں سے کچھ باتیں آپ نہیں جانتے ہیں تو نہیں جانتے ہیں اِس کی کیا بات ہے۔ آپ [پر] ایک ایسا وقت بھی آئے گا جس میں کہ آپ ہر چیز کو دیکھ پائیں گے۔ کیونکہ آپ نے معرفت کے اعلیٰ مقام کو حاصل کیا وہاں سے دیکھیں گے، جھانکیں گے تو علم کی ہر چیز آپ کے سامنے، آپ کے نیچے نظر آنے لگے گی۔ یہ اِس سوال کا جواب ہے جو میں نے خود ہی کیا تھا اور خود ہی جواب دیا تھا اور یہ سوال اِس لئے پیدا ہوگیا کہ ہم نے اسماعیلیت کی تعریف کی تھی اور اپنے مضامین کی تعریف کی تھی کہ ہمارے جو مضامین ہیں وہ اعلیٰ ہیں، وہ اعلیٰ ہیں، تو ہمارے مضامین زیادہ ہیں، ہمارے مضامین ایک ہیں یعنی اگر ہمارے

مضامین کو ایک کیا جائے تو وہ ایک ہیں اور اگر ہم اُس مضمون کو تقسیم کریں تو کئی مضامین ہیں، مثلاً ہمارے مضامین میں سے خودشناسی، امام شناسی اور پیغمبر شناسی، خداشناسی یا کہ حقیقت، رُوحانیت وغیرہ اِن تمام الفاظ کا مطلب ایک ہی ہے وہ معرفت ہے اور بعض دفعہ کچھ عزیز سوال کرتے ہیں کہتے ہیں کہ دنیا کے اندر جو مذاہب ہیں اُن کے اندر نیکی اور بدی کا تصوّر پایا جاتا ہے اور کوئی مذہب ایسا نہیں ہے جس میں کہ اُن کے معیار کے مطابق بُرائی کو بُرائی نہ کہا جائے اور اچھائی کی کوئی قدر نہ ہو۔ یہاں تک کہ جو لوگ مذہب کا کوئی تصوّر نہیں رکھتے ہیں اُن کے وہاں بھی کسی بھی قانون کے تحت اور کسی بھی عنوان سے نیکی اور بدی کا تصوّر ہے۔ تو اگر یہ بات صحیح ہے کہ نیکی اور بدی کا تصوّر ہر جگہ پر ہے تو اِس کے اجر وصلہ کے لئے ہم کیا سمجھیں اور کیا تصوّر رکھیں، یہ سوال ہے جو بعض دفعہ کچھ عزیز کرتے ہیں۔ اِس کے لئے میرا جواب یہ ہے کہ قرآن کے اندر ابدی نجات کے لئے دو شرط ہیں، ایمان [اور] عمل یعنی عملِ صالح، اب اگر ایمان کو زمانے اور دور کے ہادیٔ برحق کی ہدایت کی روشنی میں تسلیم نہ کریں تو پھر یہ ایک عام اور تمام انسانوں کے درمیان ایک مشترک سی بات ہوگی۔

اِس لئے یہاں ایمان سے مُراد وہ ایمان [ہے] جو زمانے کے پیغمبر کے ارشاد کے مطابق قبول کیا جائے اور عملِ صالح سے وہ نیک عمل مُراد ہے جو اُس ہادیٔ برحق کے امر و فرمان کے مطابق ہو۔ پھر اِس کا نتیجہ یہ نکلا کہ نجات اُسی عمل میں ہے، اُسی ایمان میں ہے جو خدا کے بھیجے ہوئے رسولوں کے مطابق انجام دیا جائے۔ چنانچہ اِس دور میں پیغمبرِ برحق یعنی حضرت محمد مصطفیٰ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے بتائے ہوئے اصولات کے مطابق ایمان لانے اور عمل کرنے کے نتیجے میں کسی کو نجات مل سکتی ہے۔ اب یہاں تک ہم نے جو سوال اُٹھایا تھا اُس کا جواب نہیں ملا بلکہ ایک تمہید ملی اور بلکہ اصل سوال یہیں سے پیدا ہو جاتا ہے، تو پھر اُن لوگوں کے لئے کیا کیا جائے یا کہ اُن کا انجام کیا ہوگا جو نیکی تو کرتے ہیں اور راہِ انسانیت پر بھی چلتے ہیں پر وہ رسول اللہؐ کو تسلیم نہیں کرتے ہیں، اِس کے لئے یہ ہے کہ اُن کو جس طرح نجات ملنی چاہئے وہ نہیں ملے گی۔ قرآن نے جو کچھ فیصلہ دیا وہ یہ ہے کہ نجات اُن ہی لوگوں کو نصیب ہوگی جنہوں نے پیغمبرِ آخر زمان کی ہدایت کے مطابق عمل کیا ہو اور باقیوں کو نہیں۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر سب لوگوں کو اُن لوگوں کے سوا جو مسلمان ہیں جہنم ملے گا، تو ہاں جہنم ملے گا لیکن جہنم کے بھی درجات [درکات] ہیں، جس طرح بہشت کے درجات ہیں اس طرح جہنم کے بھی درجات [درکات] ہیں۔ میرے کہنے کا مطلب جب میں نے کہا کہ جہنم کے بھی درجات [درکات] ہیں تو وہ درجات [درکات] اُن کے اُن اعمال کے مطابق ہوں گے جنہوں نے رسول اللہؐ کو قبول کئے بغیر عمل کیا ہے۔ تو مطلب یہ ہے کہ جہنم میں جو عذاب ہے وہ ایک جیسا نہیں ہے جس طرح سے قرآن میں ارشاد ہے کہ: إِنَّ الْمُنَافِقِينَ فِي الدَّرْكِ الْأَسْفَلِ مِنَ النَّارِ (۴:۱۴۵)، منافق لوگ جہنم کے سب سے نچلے طبقے میں ہیں یعنی منافق لوگ بدترین ہیں۔ جہنم کے درجات کے تصوّر کے نتیجے میں اب ہم یہ کہیں گے کہ اگر بحیثیتِ مجموعی دیکھا جائے تو اُن کے عمل ضائع ہو جاتے ہیں اور اگر جہنم والوں کے درجات [درکات] کو پیشِ نظر رکھا جائے تو تھوڑی سی سہولت ہوتی ہے، اور اِس کے علاوہ اگر

ہم یہ بھی تسلیم کریں کہ جہنم میں وہ لوگ دائمی طور پر نہیں رہیں گے بلکہ کچھ وقت کے بعد اُن کو نکال دیا جائے گا تو پھر اِس سے بھی اُن کے اعمال کی ایک ترتیب بن جاتی ہے، اُن کے اقوال و اعمال کے مدارج یا کہ Stages بن جاتے ہیں، [اِس میں] فرق و تفاوت پایا جاتا ہے۔ یہ ایک تجزیہ ہے اور اِس میں کافی گہرائی ہے، جو میں نے بات کی، کافی گہرائی سے بات کی، اگر میں یہ کہتا کہ ایک دم سے کہ اُن کے اعمال ضائع ہو جاتے ہیں تو اُن کے اعمال ایک اعتبار سے ضائع ہو جاتے ہیں، جس تصوّر سے جس اُمید سے وہ عمل کرتے تھے اُس کے مطابق دیکھا جائے، اُس معیار سے دیکھا جائے تو ضائع ہیں لیکن فی نفسہٖ جہنم کی گرفتاری کو سامنے رکھتے ہوئے دیکھا جائے تو اُس میں فرق ہے اور عذاب کی مدّت میں بھی فرق ہے، اِس لحاظ سے دُنیا کے اندر جتنے مذاہب ہیں اسلام سے باہر وہ درجہ بدرجہ ہیں، وہ درجہ بدرجہ ہیں۔

یہاں پر ایک اور سوال بھی ہوسکتا ہے کہ جہنم کا تصوّر قرآن کے بموجب تو دائمی ہے اور آپ نے کہا کہ وہاں سے اُن لوگوں کو نکال دیا جائے گا تو اُس میں یہ فرق کیوں ہے؟ تو وہ فرق یہ ہے کہ شریعت میں مذہب اور انسانیت کے نظام کو برقرار رکھنے کے لئے جہنم کے بارے میں جو تصوّر دیا ہے وہ شریعت کے لحاظ سے صحیح ہے لیکن بڑا خوفناک ہے اور بہت ہی مُہیب ہے ایسا ہی سمجھنا چاہئے، مثلاً آتش جہنم میں جلتے رہنے کا تصوّر رہے، پر تاویل میں دیکھا جائے حقیقت میں دیکھا جائے، تو اِس کی کیفیت اس طرح سے نہیں ہے کہ آگ کے بھڑکتے ہوئے شعلوں کے درمیان وہ لوگ جلتے رہیں گے اور وہ آگ بھی مادّی قسم کی نہیں ہے، وہ جہالت و نادانی کی آگ ہے۔ کوئی صاحبِ بصیرت جاہل انسان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھے تو اُس کی عقل کی نظر میں جاہل انسان اپنی جہالت میں جلتے ہوئے نظر آئے گا۔ یہی کافی ہے کہ وہ عقل کی نعمت سے محروم ہے، حقیقت سے محروم ہے، وہ مایوسی اور حرمانی کی آگ میں جلتا ہے وہ جہالت کی آگ میں جلتا ہے۔

اِس سلسلے میں مزید تفصیل یہ ہے کہ انسان تین چیزوں کا مجموعہ ہے انسان عقل بھی ہے، رُوح بھی ہے اور جسم بھی ہے۔ انسان عقل بھی ہے، روح بھی ہے اور جسم بھی ہے لیکن آپ باور کریں گے انسان کے اِن تین عناصر میں سے سب سے اُونچا عنصر عقل ہے، دُوسرے درجے کا عنصر رُوح ہے اور سب سے ادنیٰ عنصر جسم ہے۔ جب اِس سلسلے میں اِس ترتیب میں جسم سب سے نیچے ہے، رُوح اُس کے اوپر ہے اور عقل سب سے اُونچی ہے تو ثواب اور عذاب کی ترتیب بھی اسی طرح سے ہوگی اور سب سے بڑا عذاب عقلی ہوگا، دُوسرے درجے کا عذاب رُوحانی ہوگا اور سب سے آسان عذاب جسمانی ہوگا اور اِس سلسلے میں یہ بات بھی سمجھنا ہے کہ جو تین قسم کے عذاب ہیں اِن کے درمیان فرق بھی ہوگا، جسمانی عذاب جسمانی طور پر اور رُوحانی عذاب اُس سے الگ مختلف اور عقلی عذاب اُس سے بالکل جدا ہے۔ ثواب و راحت کا بھی یہی تصوّر رہے، سب سے بڑی راحت سب سے بڑی لذّت عقلی ہوگی، دُوسرے درجے کی لذّت و راحت رُوحانی ہوگی اور اِن میں ادنیٰ راحت جسمانی قرار پائے گی۔ اب اگر قرآن میں عذاب کا ذکر ہے اور جہنم کا ذکر ہے تو آپ خود ہی اِس گفتگو کی روشنی میں فیصلہ کریں کہ خدا جس عذاب کو عذابِ علیم یعنی دردناک عذاب یا بڑا

عذاب کہتا ہے وہ عذاب کونسا ہوگا؟ [وہ] عقلی اور علمی [ہے]۔ عقلی اور علمی عذاب جہالت اور نادانی کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے اور اگر عقلی عذاب جہالت و نادانی ہے تو عقلی ثواب علم و معرفت ہوگا اور عقلی راحت بھی علم و حکمت ہوگی۔ پس دُنیا میں جو خدا کی شناخت رکھتے ہیں وہ بہشت میں ہیں اور جو اِس سلسلے میں نادان ہیں یعنی جن کو خدا کی شناخت نہیں ہے تو یہ سب سے بڑی جہالت ہوگی اور جو سب سے بڑی جہالت ہوگی وہی سب سے بڑا عذاب قرار پائے گا۔ دیکھا آپ نے کہ دُنیا کے اندر کچھ لوگ بہشت میں ہیں اور کچھ لوگ ابھی سے دوزخ میں ہیں۔

خداوندِ عالم نے فرمایا ہے کہ اگر تم علم الیقین رکھتے تو دُنیا ہی میں تم جہنم کو دیکھ پاتے [كَلَّا لَوْ تَعْلَمُونَ عِلْمَ الْيَقِينِ۔ لَتَرَوُنَّ الْجَحِيمَ ترجمہ: اگر تم علم الیقین جانتے ہوتے تو تم دوزخ کو دیکھ سکتے (۱۰۲/ ۵۔ ۶)] ان شاء اللہ آپ ہم علم الیقین رکھتے ہیں اور دُنیا کے اندر ہم جہنم کو دیکھتے ہیں جو جہالت و نادانی ہے۔ اگر ہم اِس بات کو بھی تسلیم کرلیں کہ <u>دُنیا کے اندر سات قسم کے جانور ہیں اور وہ سات قسم کے جانور سات دوزخوں کے اندر ہیں</u> تو اُس صورت میں بھی یہی بات ہوتی ہے کہ اُن جانوروں میں عقل نہیں ہے، اُن جانوروں میں شناخت نہیں ہے اِس لئے وہ جہنم میں ہیں اور لوگوں کے بھی سات گروہ ہیں یعنی لوگوں کی بھی سات قسمیں ہیں اور یہ سات قسمیں سب کی سب جہنم ہیں۔ اِس لئے کہ [یہ] اُن سات قسم کے جانوروں کی طرح ہیں۔ جو عقل و دانش حقیقی انسانوں میں ہونی چاہئے تھی وہ اُن میں نہیں ہے۔ لہٰذا وہ بھی اُن جانوروں ہی کی طرح ہیں، پس وہ سات قسم کے جانور اور یہ سات قسم کے لوگ سب ملا کر سات قسم کے جہنم میں ہیں۔

یہاں پر بات اصل میں عذاب سے متعلّق تھی اور یہ ثابت کرنا تھا کہ جہنم میں جو لوگ جلتے ہیں اُن کا جلنا اِس طرح سے نہیں ہے جس طرح کوئی چیز مادی آگ میں جلتی رہتی ہے اور اگر مادی آگ میں کوئی انسان جلے تو اُس کو احساس ہوتا ہے، اُس کو خبر ہوتی ہے لیکن جو شخص جہالت و نادانی کی آگ میں جلتا رہتا ہے اُس کو خبر نہیں ہوتی ہے اور خبر نہ ہونا ہی بہت بڑی لعنت ہے، بہت بڑی لعنت ہے۔ کیونکہ اگر ایک شخص مادّی عذاب میں مبتلا ہو جائے اور اُس کو سمجھ بھی پائے تو اُس کی رُوح فریاد کرے گی، جب اُس کی روح فریاد کرے گی تو خداوندِ عالم کے لئے ضروری ہوگا کہ اُن کو معاف کرے اور جو لوگ جلتے رہیں گے اور جلنے کا احساس بھی نہیں رکھیں گے اور وہ اُس سے خوش ہوں گے تو کوئی طاقت اُن کی خبر گیری نہیں کرسکتی ہے، یہ قرآن کی حقیقت کو سمجھنے کے لئے ایک بنیادی بات ہے۔ بہشت کی شناخت کے سلسلے میں، دوزخ کی پہچان کے بارے میں اور رُوح، جسم اور عقل کے درمیان فرق و تمیز کے سلسلے میں اُس تصوّر سے نہ صرف بہشت کی نعمت کا پتا چلتا ہے اور دوزخ کے عذاب سے خبر ہوتی ہے بلکہ ساتھ ہی ساتھ اُن کو اِس سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ رُوحانی لذّتیں، عقلی لذّتیں اور جسمانی لذّتیں ترتیب کے لحاظ سے، فضیلت کے لحاظ سے کیسی ہیں، اِن چیزوں کی بھی خبر ہوتی ہے۔ تو عقلی غذا یا کہ عقلی راحت سب سے اُوپر ہے، رُوحانی غذا اس کے بعد ہے اور جسمانی غذا اور اس کی لذّتیں سب سے نچلے درجے پر واقع ہیں۔

اِس سلسلے میں ایک ثبوت میں آپ کو فراہم کرتا ہوں وہ یہ ہے کہ دُنیا کے اندر نشوونما پانے والی چیزیں بہت [سی] ہیں اور نمایاں طور پر نباتات سے اِن چیزوں کا آغاز ہو جاتا ہے یعنی نشوونمائی کی حد نباتات سے درختوں سے شروع ہو جاتی ہے، پھر اُس کے بعد جانور ہیں، پھر اُس کے بعد انسان ہیں۔ یا یوں کہنا چاہئے کہ رُوح کا تصوّر یا کہ روح کا وجود نباتات [میں بھی] پایا جاتا ہے۔ وہاں پر ایک ادنیٰ سی رُوح ہے جو کہ رُوحِ نباتی کہلاتی ہے، اُس کے اُوپر جانوروں میں رُوحِ حیوانی ہے، اُس کے اُوپر انسانوں میں رُوحِ انسانی ہے اور اِس کے اُوپر انسانِ کامل میں رُوحِ قدسی ہے۔

اب ہم لذّت کے فلسفے کو ذرا لیتے ہیں، اُس کا تجزیہ کرتے ہیں، تو نباتات میں کوئی لذّت نہیں ہے اُن کو کوئی احساس نہیں ہے، وجہ اِس کی یہ ہے کہ نباتات میں جو رُوح ہے وہ بہت ہی ادنیٰ رُوح ہے، بہت نچلے درجے کی رُوح ہے اِس لئے اُس میں احساس نہیں ہے، درد کا بھی احساس نہیں ہے، راحت کا بھی احساس نہیں ہے، خوشی کا بھی احساس نہیں اور غم کا بھی احساس نہیں ہے۔ اُس کے بعد اُس کے اُوپر جانوروں والی رُوح ہے جو رُوحِ حیوانی کہلاتی ہے، اُس رُوح میں نباتات کی نسبت سے احساس ہے مگر انسان کی نسبت سے اُس میں بہت کم احساس ہے اور لذّت کا بھی یہ عالم ہے کہ جانوروں میں جو لذّت ہے کھانے، پینے، سونے، جاگنے وغیرہ کی لذّتیں انسانوں کے مقابلے میں جانوروں میں بہت کم ہیں۔ بہرحال درختوں اور نباتات کے مقابلے میں زیادہ ہے، یہ کیوں؟ اِس لئے کہ یہ رُوح کی فضلیت کی وجہ سے ہے۔

تو انسان غذاؤں سے جو لذّت گیری کرتا ہے، انسان غذاؤں سے جو لذّت حاصل کرتا ہے حیوان وہ لذّت حاصل نہیں کرسکتا، یہ رُوح کے اعلیٰ اور ادنیٰ کے فرق کی وجہ سے ہے۔ اب انسانوں میں بھی مدارج ہیں، ایک بیمار آدمی غذا سے کچھ لذّت نہیں پاتا جیسا کہ ایک تندرست [آدمی] غذاؤں سے، نعمتوں سے لذّت پاتا ہے، یہ جسمانی لذّتوں کی بات ہوگئی۔ اب ہم عقلی لذّتوں کا ذکر کرتے ہیں، اب ظاہر ہے کہ عقل رُوح سے افضل ہے، عقل رُوح سے اعلیٰ ہے، لہٰذا جہاں ایک ادنیٰ رُوح اور ایک اعلیٰ رُوح میں لذّت کے لحاظ سے فرق ہے وہاں پر عقل اور رُوح میں اِس سے بھی زیادہ فرق ہوگا اور وہ یہ کہ عقلی نعمتوں کی لذّت بہت زیادہ ہوگی، نفسانی اور رُوحانی لذتوں کے مقابلے میں، تو اِس لئے ہمیں باور کرنا ہوگا کہ عقلی نعمتوں کی لذّتیں اعلیٰ ہیں رُوحانی لذّتوں کے مقابلے میں۔

اب سے چند منٹ پہلے جو ہم نے گفتگو شروع کی تھی عذاب کے بارے میں اور ثابت کیا تھا کہ عذاب تین قسم کا ہے، سب سے اُوپر عقلی عذاب، اُس کے بعد رُوحانی عذاب، اس کے بعد جسمانی عذاب، تو یہاں پر میں رُک کر پھر مجموعاً اِن تمام باتوں کا خلاصہ کروں گا کہ قرآن کے اندر خداوندِ عالم نے جس طرح عذاب کا ذکر فرمایا ہے جس طرح ثواب کا ذکر فرمایا ہے جس طرح جنّت کی لذّتوں کا ذکر فرمایا ہے اِس سے اہلِ ظاہر جسمانی چیزیں مُراد لیتے ہیں، عذاب بھی جسمانی اور ثواب بھی جسمانی، راحت بھی جسمانی اور رنج بھی جسمانی، وجہ اِس کی یہ ہے کہ وہ نادان ہیں وہ نہیں سمجھتے ہیں، انہوں نے جسم ہی کو دیکھا ہے رُوح کی شناخت حاصل

نہیں کی ہے، جب رُوح کی شناخت حاصل نہیں کی ہے تو رُوح کی غذا کو بھی نہیں جانتے ہیں رُوح کی لذّتوں کو بھی نہیں جانتے ہیں اور اُس کے ساتھ ساتھ عقل کی غذاؤں کو بھی اور اُس کی حیثیت کو بھی اُس کی حقیقت کو بھی نہیں سمجھتے ہیں۔ دیکھا آپ نے اِس مثال سے کہ دُنیا کے اندر مومن کیوں آیا ہے، علم کے مقصد کی تکمیل کے لئے آیا ہے۔

ٹائپنگ: اکبر علی پروف: نسرین اکبر

استادِ بزرگوار علّامہ نصیر الدّین نصیرؔ ہونزائی ؒ کا پُرحکمت بیان

عنوان: عذاب کی حقیقت (سوال و جواب)

کیسٹ نمبر: ۸۔ بی   تاریخ: ۱۹۷۷، کراچی

Click here for Audio

دیکھا آپ نے کہ علم کے نہ ہونے سے کیا نقصان ہوتا ہے اور علم [کے ہونے] سے کیا کیا فائدے حاصل ہوتے ہیں اور شناخت کیا چیز ہے۔ تو مومن کو رُوح کی شناخت کے سلسلے میں اِن باریک باتوں کو سمجھ لینا چاہیئے، تاکہ اُس کو نجات ملے وہ سمجھ پائے۔ ایک درمیان میں چیز ضروری ہے جو میں آپ کو بتاؤں، ضمناً میں نے کہا تھا کہ کچھ لوگ جنّت سے صرف جسمانی نعمتیں مُراد لیتے ہیں اور میں نے اشارہ کیا تھا کہ اصل نعمتیں جو ہیں وہ رُوحانی اور عقلی ہیں، تاہم میں نے اِس سے انکار نہیں کیا کہ جسمانی نعمتیں نہیں ہیں، جسمانی نعمتیں ہیں لیکن ہم اُن کو اہمیت نہیں دیتے ہیں، ہم عقلی نعمتوں کو زیادہ سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں، رُوحانی نعمتوں کو اہمیت دیتے ہیں اور جسمانی نعمتوں کو بہت کم اہمیت دیتے ہیں، تاہم وہ چیزیں ہیں ذیلی اور ضمنی طور پر، ہوسکتا ہے کہ مرنے کے بعد انسان کو ایک لطیف جسم دیا جائے اور اُس لطیف جسم کے اندر رُوح بہت زیادہ کام کرے پھر اُس کو تین قسم کی نعمتیں مہیا ہوں، اُس لطیف جسم کی بدولت عقلی راحتیں، رُوحانی نعمتیں اور جسمانی لذّتیں بھی مگر جسمِ لطیف میں۔

قرآن کے اندر کچھ ایسا اشارہ بھی پایا جاتا ہے جس سے ایک دانشمند مومن سمجھتا ہے کہ دُنیا کے اندر پیغمبروں کو لطیف غذائیں میسّر ہوتی تھیں یعنی جسمانی غذائیں لیکن لطیف، اِس کا کیا مطلب؟ اِس کا یہ مطلب کہ جس زمانے میں حضرت موسیٰ علیہ السّلام کوہِ طور پر گئے ہوئے تھے جہاں پر کہ انہوں نے چالیس دن اور رات عبادت و بندگی کی، تو اُس دوران اُن کے ساتھ کھانے پینے کی چیزیں تو نہیں تھیں، کوئی باورچی، خانصامہ اُن کے ساتھ کھلانے پلانے کے لئے تو نہیں تھا اور نہ انہوں نے اپنے عزیز وقت کو کھانا پکانے کے لئے صَرف کیا تھا۔ اُن کو جلالی غذائیں ملا کرتی تھیں، لطیف غذائیں، خوشبوؤں کی صورت میں۔ اِس کو ہم کہیں گے کہ اُن کو بہشت کی نعمتیں ملتی تھیں اور بہشت کے اندر ہم یہ کہیں گے کہ تین قسم کی نعمتیں ہیں، ہم اگلی وضاحت کو نہیں بھولتے ہیں بلکہ اُس کو اِس کے ساتھ ملا کر بتاتے ہیں کہ سب سے اُوپر کی نعمتیں عقلی اور دُوسرے درجے کی نعمتیں رُوحانی اور سب سے ادنیٰ نعمتیں جسمانی ہیں، تو موسیٰ علیہ السّلام جب کوہِ طور پر جا کر اِعتکاف کرلیا کرتے تھے تو اُس

وقت ان کو جسمانی غذاؤں کی بھی ضرورت تھی اور وہ بہشت کی غذاؤں کی قسم کی تھیں یعنی لطیف غذائیں، خوشبوؤں کی صورت میں Gases کی صورت میں، وہ منہ سے نہیں کھایا کرتے تھے بلکہ ناک کے ذریعے سے سونگھ لیا کرتے تھے، یہ ہوئی جلالی غذائیں جو کہ اکثر بلکہ تمام پیغمبروں کو یہ غذائیں ملا کرتی تھیں۔

اب ہم اِس بات کو بھی فراموش نہیں کریں گے کہ آپ نے تواریخ میں تو یہ پڑھا ہے کہ آنحضرتؐ کو غارِ حرا تک کچھ غذائیں اور توشہ وغیرہ پہنچا دیا جاتا تھا، یہ بالکل ظاہری بات ہے ہوسکتا ہے کہ یہ ظاہر میں ایسا ہو جب کہ ایک معمولی انسان بھی رُوحانیت کے اندر یہ تجربہ کرتا ہے کہ اُس کو غذائیں ملا کرتی ہیں تو آنحضرتؐ تو سردارِ رسول ہیں اور حبیبِ خدا ہیں اور ہماری معرفت یہ بتلاتی ہے کہ اُن کو بھی غذائیں ملا کرتی تھیں اور ہم نے جنّت کی جسمانی غذا کی جو تعریف کی وہ بھی اہلِ ظاہر کی غذا سے مختلف ہے۔ چونکہ کچھ لوگ تو صرف یہ کہتے ہیں کہ بس وہاں انگور ہیں اور انار ہیں، یہی انار اور یہی انگور اور یہی میوے کیلے وغیرہ جن کا ذکر قرآن کے اندر ہے، قرآن کے اندر تو جو ذکر ہے وہ صحیح ہے لیکن خداوندِ عالم اور اُس کے پیغمبر لوگوں کی عقل کے مطابق کلام فرماتے ہیں اور دانشمند اُس میں سے مطلب کو سمجھ لیتے ہیں اور خدا کا کلام کچھ Common ہوتا ہے مشترک ہوتا ہے اُس میں سے ہر شخص اپنی فہم کے مطابق سمجھ لیتا ہے، دانشمند اپنی دانش کے مطابق سمجھتا ہے اور نادان اپنی نادانی کے مطابق اُس میں سے سمجھ لیتا ہے۔ تو خدا کا جو کلام ہے کچھ اِس طرح سے ہوتا ہے اور پھر اُس میں گنجائش ہوتی ہے کہ ادنیٰ درجے سے اعلیٰ کی طرف جایا جائے۔ یہ قرآن فہمی بھی ہے اور اِس میں معرفت بھی ہے اور لذّتوں کا بھی ذکر ہے، جہنم کا اور دوزخ کا بھی ہم نے ذکر کیا۔

بہرحال علم کے سلسلے میں ایک سوال ہوا تھا تو اُس سلسلے سے شروع ہو کر یہ بات نکلی اور اِس میں ایک بات سے دوسری بات پیدا ہوگئی اور ایک سوال کے بعد دوسرا سوال پیدا ہوا۔ اِس سے آپ کو لگتا ہے کہ علم کے اندر کتنی باریکیاں ہیں اور معرفت کیا چیز ہے یہ دنیا کی کتاب کے اندر ایسی باتیں نہیں ہیں، یہ صرف رُوحانی علم کا معجزہ ہے کہ اُس کے سمجھنے سے بہت ہی فائدہ ہوتا ہے اور مومن کے لئے خداوند کی طرف سے [یہ] اہتمام ہے کہ وہ حقیقتوں کو با آسانی سمجھ لیتا ہے۔ اِس سلسلے میں اگر کوئی سوال پیدا ہوا ہو تو بڑی خوشی سے آپ وہ سوال کریں ہم ان شاء اللہ اُس کے جواب کے لئے کوشش کریں گے۔

سوال: الامین کا کہنا ہے، وہ میرے سوال کا Refrence دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ آپ نے کہا کہ علم ایک طرح سے ختم ہو جاتا ہے اور دوسری طرح سے ختم نہیں ہوتا ہے اور اِن دونوں باتوں میں سے کونسا اچھا ہے؟

جواب: تو میں کہوں گا کہ طریقہ وہ اچھا ہے جس میں علم ختم ہو جائے اور علم کے پُل سے گزر کر خدا تک پہنچا جائے تو یہ کام بہت ہی مفید ہے، علم کا ایک پُل بنایا جائے، علم کا ایک راستہ بنایا جائے تا کہ خدا تک پہنچا جائے اور علم پسِ پُشت ہو اور علم سے اُوپر جایا جائے یہ بہتر ہے۔

سوال: اپنے عزیز فتح علی کا سوال ہے جو شاہدہ کی طرف سے ہے کہ سورۂ رحمان میں ایک آیت ہے: [یُعْرَفُ الْمُجْرِمُونَ بِسِیمَاهُمْ فَیُؤْخَذُ بِالنَّوَاصِی وَالْأَقْدَامِ (۵۵:۴۱)] جس کے معنی یہ ہیں کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ مجرموں کی پیشانی کے بال کو اور اُن کے قدموں کو پکڑے گا۔ [تو اِس کی تاویل کیا ہے؟]

جواب: تو اِس کی تاویل دو طرح سے ہے، ایک تاویل یہ ہے کہ خداوندِ عالم رُوحانی دَور میں جب لوگوں پر رُوحانیت مسلّط کر دے گا تو اُس وقت اُن کے خیالات و افکار کو پکڑے گا جو اُن کے قدم ہیں اور پیشانی کے بالوں کو پکڑے گا جو اُن کے حواسِ ظاہر اور حواسِ باطن ہیں۔ اِس سے ہم کو یہ تصوّر ملتا ہے کہ اگر رُوحانیت آتی ہے اور جب بھی آتی ہے تو کہاں سے آتی ہے اور اُس کا ٹھکانہ کیا ہے، آخر ہر چیز کا کوئی نہ کوئی مرکز ہوتا ہے۔ تو اِس کا جواب یہ ہے کہ اگر آپ ذکر کرتے ہیں تو اُس ذکر پر رُوحانیت مسلّط ہو جاتی ہے، خواہ آپ ذکر کرتے ہیں یا ذکر نہیں کرتے ہیں، کچھ خیالات ہیں، کچھ افکار ہیں تو اُن پر رُوحانیت مسلّط ہو جاتی ہے اور دُوسری چیز جہاں پر رُوحانیت مسلّط ہو جاتی ہے وہ حواسِ ظاہر اور حواسِ باطن ہیں۔ حواسِ ظاہر، حواسِ باطن پیشانی کے بالوں کی طرح ہیں۔ حواسِ ظاہر [کے] معنی دیکھنا، سننا، سونگھنا وغیرہ اور حواسِ باطن، فکر، خیال، سوچ، وِچار وغیرہ۔ تو اِن چیزوں پر رُوحانیت مسلط ہو جاتی ہے اور اِن چیزوں کے ذریعے سے خدا کھینچتا ہے، گنہگاروں کو بھی اور پرہیزگاروں کو بھی۔

خداوند نے جس عنوان سے بھی یہ ذکر فرمایا ہو تو اُس میں رُوحانیت جس مرکز پر مسلّط ہو جاتی ہے اُس کے لحاظ سے سب لوگ ایک ہیں، اور رُوحانیت بڑے پیمانے پر جب مسلّط ہو جاتی ہے تو وہ پیشانی میں آتی ہے۔ خیالات اور افکار کو یا ذکر کو قدم کہا گیا، پاؤں قرار دیا گیا تو ٹھیک ہے جس طرح جسمانی مثال میں ہم یہاں سے وہاں جب جاتے ہیں تو قدموں کو استعمال کرتے ہیں، پاؤں سے چلتے ہیں، اسی طرح رُوحانیت میں بھی ایک منزل سے دُوسری منزل میں جانے کے لئے ہمارا جو ذکر ہے وہی کام دیتا ہے یا خیالات و افکار وہ کام دیتے ہیں۔ ہم اُن کے ذریعے سے چلتے ہیں ہماری رُوحانی رفتار اور ہماری رُوحانی چال جو بنتی ہے وہ ہمارا ذکر ہے، ہمارے افکار ہیں اِس معنی میں ذکر کو پاؤں یا کہ قدم قرار دیا گیا ہے کہ وہی ذکر ہم کو آگے بڑھاتا ہے اور حواس کو پیشانی کے بال قرار دیا گیا ہے اور پیشانی کے بال سے پکڑنے کی تاویل

ہے کہ خداوندِ عالم رُوحانیت کی گرفت سے حواسِ ظاہر اور حواسِ باطن کو پکڑے گا، ذکر کو قدم کہا گیا ہے، ذکر کو لاٹھی کہا گیا ہے، موسیٰؑ کی لاٹھی کیونکہ لاٹھی چلنے میں مدد دیتی ہے۔ چنانچہ ذکر بھی چلنے میں مدد دیتا ہے اس لئے عصائے موسیٰؑ یعنی حضرت موسیٰؑ کی لاٹھی ذکر ہے، ذکر کو کشتی کہا گیا ہے کہ رُوحانیت کے سمندر پر چلنے کے لئے جو کشتی ہے وہ ذکر ہی کی ہے اسمِ اعظم کی ہے۔ اِس معنی میں اسمِ اعظم کو اور ذکر کو کشتی کہا گیا ہے کہ جس طرح کشتی مسافر کو کنارے تک پہنچاتی ہے اسی طرح ذکر ساحلِ مُراد تک پہنچا دیتا ہے اور ذکر کو گھوڑا کہا گیا ہے کیونکہ گھوڑے سے جہاد کیا جاتا ہے اور گھوڑے سے سفر کیا جاتا ہے، گھوڑے سے آدمی کو مدد ملتی ہے اِس طرح ذکر ہی ہے جو آپ کی رُوحانیت کا گھوڑا ہے، ذکر ہی کو کمند کہا گیا ہے وہ کمند جو آسمان پر پھینکا جاتا ہے اور پھر آسمان پر چڑھا جاتا ہے، ذکر ہی کمند ہے، ذکر کو رسّی کہا گیا ہے ذکر رسّی ہے کہ یہ رسّی آسمان سے اُتری ہے۔ اِس رسّی کو مضبوطی سے پکڑ کر آسمان پر پہنچنا ہے۔ نیز ذکر اِس معنی میں بھی رسّی ہے کہ اگر کوئی انسان کہیں کسی کھڈے [گڑھے] میں گر گیا ہے تو رسّی ڈالی جاتی ہے اور وہ اُس کو پکڑتا ہے تو آدمی اس کو کھینچ کر نکالتے ہیں۔ اسی طرح یہ دُنیا ایک کھڈے [گڑھے] کی طرح ہے اگر ذکر کی رسّی سے ہم منسلک ہو جائیں تو خداوند ہم کو عالمِ بالا پر اِس ذکر کی رسّی کے ذریعے سے اُٹھا لیتا ہے۔ اِس معنی میں ذکر رسّی ہے اور جہاں پر خدا نے فرمایا ہے کہ: [وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا (۳:۱۰۳)] تم سب مل کر ذکر کی رسّی کو مضبوطی سے تھامو، تو یہ خدا کی رسّی خدا کا نام ہے یعنی امامؑ کا نام ہی خدا کی رسّی ہے۔ ذکر کو سیڑھی کہا گیا ہے قرآن میں ایک جگہ پر اشارہ ہے اگر تم سے ہو سکتا ہے تو ایک سیڑھی لگاؤ اور اِس کے ذریعے سے آسمان پر چڑھو تو آسمان کی چھت کی سیڑھی ذکر ہے [۳۸:۲۸]۔ اِس ذکر کی سیڑھی سے کوئی عالمِ بالا کی چھت پر چڑھ سکتا ہے۔ جو ذکر کی سیڑھی کو قائم رکھتا ہے اور اُس پر چڑھتا ہے تو وہ کامیابی کی چھت پر پہنچ سکتا ہے۔

مولائے رُوم نے علم کو آسمان کی سیڑھی قرار دیا ہے:

[حسِ دنیا نردبانِ این جهان　　حسِ دینی نردبانِ آسمان

دنیا کی حِس، دُنیا کی سیڑھی ہے، دین کی حِس، دین کی سیڑھی ہے] اور حقیقت میں وہ بات اور یہ بات ایک ہے اور اِن دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ ذکر انگوٹھی اور انگشتری ہے، ذکر سب کچھ ہے۔ پیغمبروں کے سلسلے میں قرآن کے اندر جو کچھ ارشاد فرمایا گیا ہے اور ہر پیغمبر کی کوئی نہ کوئی فضیلت، کوئی نہ کوئی معجزہ بتایا گیا ہے تو وہ معجزہ ہر پیغمبر کا ذکر ہی تھا اور [معجزہ] ذکر کے اندر کیوں نہ ہو، ذکر چونکہ نور ہے، ذکر چونکہ امامؑ کی ہستی ہے، امامؑ کا ایک روپ ہے، امامؑ کی ایک شکل و صورت ہے اس لئے ذکر سب کچھ ہے، ذکر سب کچھ ہے۔

سوال: شاید آپ یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ آیا شیطان کوئی ایک فرد ہے یا وہ کوئی مجموعی درجہ ہے۔ نیز آپ پوچھتے ہیں کہ شیطان نے جو کہا کہ میں تو آگ سے ہوں اور آدم مٹی سے ہے (۳۸:۷۶) تو اس کی حقیقتِ حال کیا ہے؟

جواب: جب کہ کوئی مخلوق کسی ایک عنصر سے پیدا نہیں ہوئی ہے اور اگر انسان ہے یا آدم ہے وہ بھی تو صرف مٹی ہی سے پیدا نہیں کیا گیا ہے بلکہ اُس میں [بھی] چار عناصر ہیں تو اس طرح یہ کیسے ممکن ہے کہ شیطان کو یا جنّ کو صرف ایک عنصر سے پیدا کیا گیا ہے۔ تو اِس میں مجموعاً دو سوال ہوئے ایک یہ کہ شیطان کا مقام یا جگہ کس طرح سے ہے ایک فرد پر مشتمل ہے یا کہ وہ ایک مجموعی مرتبہ ہے، [یا وہ] ایک جگہ ہے۔ تو پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ وہ ایک مقام ہے، وہ ایک جگہ ہے جہاں پر بحیثیتِ مجموعی بھی شیطان کا تصوّر ہو سکتا ہے اور ایک فرد بھی شیطان کہلا سکتا ہے۔ کیونکہ اِس میں تین باتیں ہیں۔ شیاطین بھی ہیں، شیطان بھی ہے اور جہاں شیاطین ہیں تو اُس میں بہت سے افراد کا ذکر ہوا اور جہاں شیطان ہے تو اُس میں ایک فرد کا ذکر ہوا اور اگرچہ وہ ایک فرد ہے تاہم وہ سب کا نمائندہ ہے اور وہ ایک خالی جگہ ہے جس کو وہ پُر کرتا ہے اور بحیثیتِ مجموعی بھی ہے اور بحیثیتِ انفرادی بھی ہے تو شیطان کا تصوّر یہ ہے۔

جس طرح شیطان کے مقابلے میں ہادیٔ برحق ہے تو ایک لحاظ سے ہادیٔ برحق ایک ہے، ایک فرد ہے، ایک شخص ہے اور دُوسرے لحاظ سے ہادیٔ برحق کے حدود ہیں، ہادیٔ برحق کا تشخص حدود کے ذریعے سے ہوتا ہے کہ اُس کے کتنے کتنے حدود ہیں اور وہ اُن حدود پر مشتمل ہے اور ہم کو اِس تصوّر سے مدد ملتی ہے جہاں پر ہم خدا کی خدائی کو بھی ایک مجموعی حقیقت قرار دیتے ہیں، جو حقیقتُ الحقائق یا کہ Monorealism ہے۔ جہاں پر خدا کو ایک لحاظ سے اکیلا ہونا چاہئے تھا وہ بھی اِس طرح سے اکیلا نہیں ہے جس طرح سے عام طور پر سمجھ لیا جاتا ہے بلکہ خدا کی حقیقت بھی کئی کئی حقیقتوں کی وحدت کا نام ہے۔ تو پھر دُنیا کے اندر کوئی ایک فرد کسی درجے پر نہیں ہو سکتا ہے بلکہ اُس کے اندر بہت سی اِکائیاں ہیں۔ یہاں تک کہ ایک شخص کے اندر بھی کئی کئی رُوحیں ہیں۔

اب جہاں پر سوال تھا کہ [قَالَ أَنَا خَيْرٌ مِنْهُ خَلَقْتَنِي مِنْ نَارٍ وَخَلَقْتَهُ مِنْ طِينٍ (۳۸:۷۶)] شیطان نے یہ کیوں کہا کہ تو نے آدم کو مٹی سے پیدا کیا ہے اور مجھ کو آگ سے پیدا کیا ہے، پھر میں جب آگ سے ہوں اور ایک روشن چیز سے ہوں تو مٹی ایک تاریک چیز ہے اُس کے سامنے میں کیوں جھکوں۔ یہ اُس کو [شیطان کو] کچھ رُوحانی قوت حاصل تھی اُس پر اُس نے فخر کیا۔ کچھ اسماعیلی کتابوں میں یہ تاویل اِس طرح سے ہے کہ اس رُوحانی قوت کو اُس نے آگ قرار دیا، وہ رُوحانی قوت آگ کی طرح زبردست تھی اور مٹی سے مُراد یہاں ایمان ہے، عقیدہ ہے اور آدم کا آغاز عقیدے سے ہوا تھا اور

ابلیس اُس وقت ایک رُوحانی درجے پر فائز تھا اور وہ بہت ترقی پر تھا، آدم اُس کے لحاظ سے بہت Junior تھا۔ لہٰذا اُس نے اپنی رُوحانی تخلیق کا ذکر کیا اِس میں جسمانی تخلیق کا ذکر نہیں ہے۔

[شیطان] عظیم درجے پر تھا اور اُس نے اعتراض کیا۔ [وہ] کچھ لوگوں کے مقابلے میں رُوحانیت کے عظیم درجے پر تھا اور آدم کے اندر جو باطنی فضیلت تھی البتہ اُس سے وہ بے خبر تھا۔ جس طرح کہ کسی زمانے میں جب کچھ لوگ امامؑ سے رُوگردان ہو جاتے ہیں تو اُن کے رُوگردان ہونے کا سبب کوئی بڑا آدمی ہو جاتا ہے، جس کے پاس ظاہری علم یا کہ سیاست کا کوئی مقام ہوتا ہے اُس گمراہی کا سبب کوئی چھوٹا آدمی تو نہیں بن سکتا ہے، کوئی بڑا آدمی اِس گمراہی کا سبب بن جاتا ہے۔ چنانچہ ابلیس بہت قسم کے ہیں، اور اُس میں جو آدم سے ابلیس رُوگردان ہوا وہ کوئی عالم شخص تھا۔ البتہ جس میں ظاہری علم زیادہ تھا اور جس کی وجہ سے اُس نے فخر کیا اور وہ رُوگردان ہو گیا۔

سوال: صاحب! سلسلۂ نورِ امامت [ص ۵۹] سے سوال ہے کہ اُس میں آپ نے دین کے بارہ (۱۲) درجات کا ذکر کیا ہے یعنی مستجیب، ماذون ہر ایک کے سامنے آپ نے اسلام کے مہینے دے رکھے ہیں، مستجیب کے سامنے محرّم ہے اور امامؑ کے سامنے شعبان تو کیا اِن مہینوں سے اِن درجات کی کوئی نسبت ہے؟

جواب: جس طرح سال بارہ مہینوں سے مکمل ہو جاتا ہے، اسی طرح دین کا سال بھی ان بارہ مراتب سے مکمل ہو جاتا ہے اور شعبان اور رمضان جو ہے وہ نواں مہینہ ہے اور رمضان خدا کے ناموں میں سے ہے، جس کے معنی ہیں کہ اساس خدا کے ناموں میں سے ہے اور جہاں پر خدا نے فرمایا ہے کہ: رمضان کے مہینے میں قرآن نازل ہوا (۲:۱۸۵) اِس کے معنی بھی یہ ہیں کہ اساس کی ذات میں قرآن نازل ہوا۔

سوال: صاحب! قرآن میں شجرۂ ممنوعہ کے پاس جانے سے آدم کو منع فرمایا گیا تھا، حالانکہ خدا نے آدمؑ میں اپنی رُوح پھونکی تھی پھر وہ کیوں شجرۂ ممنوعہ کے پاس گئے؟ اِس کی کچھ وضاحت فرما دیجئے۔

جواب: بزرگانِ دین نے شجرۂ ممنوعہ کی تاویل کی ہے۔ اور ہمارے ایک بزرگ مولائے رُوم نے مثنوی میں بھی تاویل کی ہے کہ:

[دام آدم خوشۂ گندم شده تا وجودش خوشۂ مردم شده

ترجمہ: گندم کا دانہ آدم کے لئے پھندا بن گیا، تا کہ اُس کا وجود انسانیت کا گندم (بیج اور اصل) بن جائے۔
(مثنوی، جلدِ اوّل شعر نمبر ۲۷۹۰)] اور المؤیّد فی الدّین الشیرازی نے بھی اپنی کسی کتاب میں اِس کا ذکر کیا ہے۔ تو وہ ایک مصلحتِ

خداوندی تھی کہ آدم کے اس فعل میں حکمت ہی حکمت تھی۔شرعی طور پر آپ سوچیں اور فرض کریں کہ اگر آدمؑ اُس درخت کے قریب نہیں جاتا اور اُس کے پھل میں سے نہیں کھاتا اور ہمیشہ کے لئے بہشت میں رہتا تو اتنی بڑی دُنیا آباد نہیں ہو جاتی اور اللہ کا دین روشن نہیں ہوتا، ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر دُنیا میں نہیں آتے، اتنے سارے اولیاء، اتنے عارف، اتنے عاشق، اتنے مومن غرض یہ کہ خدا کی اتنی عظیم سلطنت قائم نہیں ہوتی۔لہٰذا اُس نے جو فعل کیا اُس کے اندر حکمت ہی حکمت تھی۔لیکن وہ فعل بظاہر ایک غلطی کی صُورت میں تھا جس پر انہوں نے کوئی فخر تو نہیں کیا بلکہ نادم ہو گئے اور انہوں نے خدا کے حضور میں توبہ کی۔لہٰذا اُن کا بہشت سے نکل آنا، انسانیت کے لئے ایک عظیم قربانی تھی۔ بظاہر نافرمانی صحیح لیکن بباطن اِس میں بہت ہی عظیم رحمت تھی۔ابلیس نے جو نافرمانی کی تھی اُس میں اور آدم نے جو نافرمانی کی تھی اُن دونوں میں بڑا فرق تھا۔ ابلیس نے جو نافرمانی کی وہ سخت نافرمانی تھی اور پھر اِس پر مزید [یہ کہ] اُس نے توبہ بھی نہیں کی پشیمان بھی نہیں ہوا، بلکہ اس نے یہ کہا کہ: [رَبِّ بِمَآ أَغۡوَيۡتَنِي (۳۹:۱۵)] خدایا! تم نے مجھ کو گمراہ کر دیا، اِس کا الزام اُس نے خدا پر رکھا اور آدمؑ نے جو فعل کیا گو کہ اُس کے اندر خدا کی مصلحت بھی تھی، لیکن اُس کو ایک غلطی قرار دے کر آدم علیہ السّلام نے اپنے اُوپر لیا اور اس کے لئے اُس نے گریہ وزاری کی، [یہ] نہیں کہا [کہ] میرے کام میں حکمت ہے، اُس کو ایک غلطی اور نافرمانی قرار دیا، بہت رویا، بہت رویا۔حکمت اور مصلحت وہ جانتا تھا یا نہیں جانتا تھا لیکن [آدم] نے اُس کو بالکل نافرمانی قرار دیا، آدم بہت رویا، بہت توبہ کی، توبۂ آدم مشہور ہے لیکن آپ قرآن میں دیکھیں کہ ابلیس نے کیا کہا: قَالَ رَبِّ بِمَآ أَغۡوَيۡتَنِي لَأُزَيِّنَنَّ لَهُمۡ فِي ٱلۡأَرۡضِ وَلَأُغۡوِيَنَّهُمۡ أَجۡمَعِينَ (۳۹:۱۵)۔خدایا! بہ سبب اِس کے کہ تم نے مجھ کو گمراہ کر دیا اور میں آدم کی اولاد سے انتقام لے لوں گا۔

اُس نے گناہ کیا اور اُس کی وجہ اُس نے خدا [کو] قرار دیا اور پھر توبہ بھی نہیں کی اور پھر وہاں رُکا بھی نہیں، اُس نے تو آگے چل کر انتقام لینے کے لئے شروع کیا، ایک گناہ سے دُوسرا پھر تیسرا پھر چوتھا، بس وہ گناہوں کا ایک درخت بن گیا جس کی بہت ساری شاخیں [بن گئیں]، تو تکبّر تمام گناہوں کی جڑ ہے۔شیطان نے سب سے پہلے تکبّر کیا تھا تو جہاں تکبّر ہو تو اُس میں نہ تو توبہ کی گنجائش ہے، نہ گریہ وزاری کا سوال پیدا ہو سکتا ہے اور نہ پشیمانی کا، تکبّر ہے تو اُس میں سب گناہ بھرا ہوا ہے کوئی صُورت نہیں ہے باز آنے کی، توبہ کرنے کی، پشیمان ہو جانے کی، سمجھنے کی، تکبّر میں جہالت بھی ہے، نادانی بھی ہے، فخر بھی ہے سب کچھ ہے۔

سوال:۔ سر! آپ نے جو ابھی سمجھایا کہ دوزخ میں جو لوگ ہیں اور دوزخ کی آگ میں جو جلتے ہیں وہ اِس

طرح سے نہیں ہے جیسا کہ ظاہری آگ میں لوگ جلتے ہیں لیکن اس طرح سے ہے کہ ذہنی عذاب میں وہ جلتے ہیں ۔تو اس میں کیا حکمت ہے؟

جواب: اِس کا جواب اِس طرح سے ہے کہ ہمیں یہ ماننا ہوگا کہ دُنیا الگ اور آخرت الگ نہیں ہے ۔اگر چہ بعض مثالوں میں تعلیم کے لحاظ سے یا تصوّر دینے کے لحاظ سے ہم آخرت کا الگ ذکر کرتے ہیں اور دُنیا کا الگ ذکر کرتے ہیں لیکن اِس کے باوجود یہ ماننا پڑے گا کہ دُنیا کے اندر آخرت ہے اور آخرت کے درمیان دنیا ہے ۔ اِس کی مثال ہم خود انسان ہی ہیں، مثلاً ہماری رُوح جو ہے وہ آخرت ہے اور ہمارا جسم جو ہے وہ دُنیا ہے لیکن رُوح جسم سے الگ نہیں ہے اور جسم رُوح سے جُدا نہیں ہے، تو دنیا اور آخرت مل کر ہیں اور یہ دونوں الگ الگ نہیں ہیں اور جہاں ذہنی عذاب کا ذکر ہے وہ ذہنی عذاب اِس جسمانی زندگی میں بھی ہے اور مرنے کے بعد بھی ہے ۔کیونکہ ذہن سے مُراد رُوح ہے اور رُوح نہ صرف جسم سے وابستگی کی وجہ سے قائم رہ سکتی ہے بلکہ اِس جسم کو چھوڑنے کے بعد بھی رُوح ہے اور رُوح کے اندر ذہن ہے، رُوح کے اندر تصوّر ہے ۔تو لہٰذا جب رُوح اِس جسم کو چھوڑ دے گی تو اُس وقت اُس کا ذہنی عذاب اور بھی بڑھ جائے گا اور اگر اُس کو راحت کا تصوّر ہے تو جسم سے الگ ہونے کے بعد اُس میں بھی اضافہ ہو جائے گا، کیوں؟ جسم ذہن کے لئے بعض دفعہ مُخل ہو جاتا ہے اور جب جسم رُوح سے الگ ہو تو اُس وقت رُوح کے اندر جو تصوّرات ہیں وہ زیادہ اُبھریں گے وہ زیادہ خالص اور آزاد ہو جائیں گے تو اُس وقت رُوح کے اندر جو بھی کیفیت ہو، وہ اور زیادہ نمایاں ہو جائے گی ۔ عذاب کا تصوّر ہے تو اُس میں اضافہ ہو جائے گا اور اگر ثواب کا تصوّر ہے تو وہ اور زیادہ روشن ہو جائے گا ۔ یہ اِس لئے کہ عذاب اور ثواب دو قسم کے ہیں، دُنیوی زندگی میں اور مرنے کے بعد مگر دُنیوی زندگی میں کچھ کم ہے اور مرنے کے بعد زیادہ ہے ۔ یہ تو انسان کی زندگی کے اعتبار سے ہے اور اُس وقت تک ہے جب تک کہ خدا کا منشاء ہے ۔ اِس سلسلے میں پیر ناصر خسروؒ کا ایک شعر ہے وہ یہ کہ:

زدُنیا تا بعقبیٰ نیست بسیار ولی در رہ وجودِ تُست دیوار

دُنیا سے لے کر آخرت تک کچھ زیادہ مسافت تو نہیں ہے لیکن درمیان میں تیری ہستی حائل ہے، تیرا وُجود ہے اِس وجود کو ہٹا تصوّراتی طور پر یا مر کر تو دُنیا اور آخرت ایک ہو جائے گی، اپنی ہستی کو درمیان سے علم اور معرفت کے ذریعے سے ہٹالیں یا کہ جسمانی موت سے ہٹالیں تو اُس وقت دُنیا اور آخرت ایک ہو جائے گی ۔ ہم علم الیقین کے ذریعے سے اپنی ہستی کو ہٹائیں تو دُنیا اور آخرت ایک ہیں ۔ جس طرح ایک گول چیز ہے اور وہ کافی بڑی چیز ہے جس کا ایک پہلو اُس کمرے سے

ظاہر ہے اور دُوسرا پہلو اِدھر سے ظاہر ہے اور وہ اِس دیوار کے درمیان میں ہے تو وہ چیز اُس کمرے میں بھی ہے اور اِس کمرے میں بھی ہے اور جس طرح سورج ہے کہ وہ گول شئ ہے کہ وہ ایک گول کائنات ہے تو وہ اپنی گولائی سے اور دن کے وقت ہماری طرف بھی روشنی ڈالتا ہے اور پسِ پشت جو فضا ہو، جو آسمان کا حصّہ ہو اُس پر بھی روشنی ڈالتا ہے۔ اسی طرح رُوح کا ایک پہلو ہماری شخصیت سے نمایاں ہے اور دُوسرا پہلو عالمِ آخرت کی طرف ہے اور خالص رُوحانیت کی طرف ہے تو اُدھر بھی ہے اور یہ دُنیا اور آخرت کے باہم مل کر ہونے کی ایک مثال ہے۔

آنحضرتؐ کو بنی اسرائیل کے انبیاء کے اندر جو امامت تھی وہ آنحضرتؐ میں لوٹ کر آئی تھی، [جب وہ] سفرِ شام پر جا رہے تھے تو رسول اللہؐ کے زمانے میں بنی اسرائیل کا جو آخری امام تھا انہوں نے خوشخبری کے ساتھ مقدّس چیزیں اور امامت کی علامتیں آنحضرتؐ کو سونپیں اور پھر اس طرح سے بھی ایک شان تھی آنحضرتؐ کے آباء و اجداد میں۔

چونکہ ہمارے یہاں بعض دفعہ <u>امامت دو قسم کی ہوتی ہے امامِ مستقر کی امامت اور امامِ مستودع کی امامت</u>، تو آنحضرتؐ کے اپنے آباء و اجداد میں اِستقرار کی امامت تھی اور بنی اسرائیل کے خاندان میں اِستیداع، امانت والی امامت تھی۔ تو یہ امانت والی امامت صرف ایک شخصیت کے لئے بھی ہو سکتی ہے اور چند پشتوں کے لئے بھی ہو سکتی ہے۔ تو اسحاقؑ سے شروع کر کے آنحضرتؐ کے زمانے تک جو امامت بنی اسرائیل کے انبیاء میں چلتی رہی تھی وہ حضرت حسنؑ والی امامت تھی اور جو آنحضرتؐ کے اپنے آباء و اجداد میں سے امامت گزر کر [حضرت] ابوطالبؑ اور [حضرت] علیؑ میں منتقل ہوئی وہ [حضرت] حسینؑ والی امامت تھی۔ آپ کو تعجب ہوگا حالانکہ یہ ایک بحث ہے ہمارے یہاں کہ [حضرت] حسنؑ امام تھے یا نہیں تھے؟ لیکن میں آپ کو آج ہی بتاتا ہوں یا ہو سکتا ہے کہ میں نے پہلے بھی اشارہ کیا ہو کہ حضرت حسنؑ بھی امام تھے۔ لیکن ایسی امامت کے مالک تھے جو کہ ایک پشت یا کہ کئی پشتوں کے لئے ہوا کرتی ہے اور پھر لوٹ کر اصل مقام کی طرف جاتی ہے۔ تو اِس سے معلوم ہوا کہ جو امامت باپ سے بیٹے کو منتقل ہوتی ہے وہ صحیح ہے وہ عام قاعدہ ہے اور بھائی سے لوٹ کر جو بھائی کو چلی جاتی ہے وہ مُستثنیات میں سے ہیں اور آپ جانتے ہیں کہ قانون جہاں پر بھی ہو اور جس سلسلے کا بھی قانون ہو اُس میں ایک تو عام قاعدہ ہوتا ہے جو قانون کے عام موضوع کی طرح ہوتا ہے، عام موضوع کے لحاظ سے ہوتا ہے۔ لیکن اِس کے ساتھ ساتھ مُستثنیات بھی ہوتی ہیں، اِس کو Exceptional Cases کہتے ہیں یا جس طرح سے آپ اُن کو یاد کریں یا جو کچھ بھی آپ نام رکھیں۔

جو لوگ کہتے ہیں کہ امامت کو صرف باپ سے بیٹے میں منتقل ہونا چاہئے اور اِس کے سوا نہیں، تو وہ لوگ نہیں

سمجھتے ہیں، وہ سوچتے بھی نہیں ہیں کہ اُن کے سامنے یہ سوال ہونا چاہئے، انہیں یہ سوچنا چاہئے کہ پنجتنِ پاک کے زمانے میں پانچ حضرات میں سے ہر ایک میں نور تھا یا نہیں تھا؟ ظاہر ہے کہ ہر ایک میں نور تھا، اچھا! اگر صرف باپ سے بیٹے میں نور منتقل ہونا ہے اور اِس کے سوا اور کوئی طریقہ نہیں ہے تو محمدؐ میں جو نور تھا وہ کہاں گیا؟ ظاہر ہے کہ وہ علیؑ میں آ گیا تو اِس سے ہم کو باپ کے علاوہ بھی نور کے آنے کا اُصول مل گیا۔ فاطمہؑ میں جو نور تھا وہ کہاں گیا؟ ظاہر ہے کہ حسنؑ اور حسینؑ میں منتقل ہو گیا، حسنؑ میں جو نور تھا وہ کہاں گیا؟ ظاہر ہے کہ بھائی میں منتقل ہو گیا، اِس کے علاوہ آنحضرتؐ کو نور کہاں سے ملا؟ ظاہر ہے کہ ابو طالبؑ سے ملا تو ابو طالبؑ آنحضرتؐ کے اپنے باپ تو نہیں تھے، اِس کے علاوہ بنی اسرائیل میں جو مرتبہ تھا وہ کیسے آنحضرتؐ کو ملا؟ بنی اسرائیل [میں] کچھ آنحضرتؐ کے آباء و اجداد تو نہیں تھے، یہ سب چیزیں جاننے کی ہیں، تاکہ ہمیں پورے دَور کی امام شناسی کے لئے تیاری ہو سکے۔ تو ایک دانشمند مومن کے لئے یہ سب باتیں جاننے کی ہیں اور اِس باریکی سے سوچنے کے سوا ہم امامؑ شناسی کے تمام پہلوؤں سے باخبر نہیں ہو سکتے ہیں۔

یہ ہو سکتا ہے کہ وہ [گوتم بدھ] امامؑ کے اُن عاشقوں میں سے ہو کیونکہ یہاں ایک تصوّر ہے حجتانِ شب اور حجتانِ روز کے عنوان سے۔ حجتانِ روز کا مطلب ہے وہ پیر، بزرگ، حجّت جو نمایاں ہیں جس طرح دن ظاہر ہے اِس طرح وہ ظاہر ہیں اور اسماعیلی مذہب میں کام کر رہے ہیں یا کر چکے ہیں۔ حجّتانِ شب کا مطلب ہے جس طرح رات کی تاریکی میں کوئی چیز نظر نہیں آتی ہے لیکن وہ موجود ہوتی ہے اور کام بھی کر سکتی ہے اسی طرح کچھ ایسے پیشوا، رہنما جو دُوسری قوموں میں آئے ہوئے ہیں کہ اُن قوموں کا کوئی وجود بنے اور ان کے Level پر ان کی رہنمائی ہو تو دُنیا کے اندر کچھ لوگ آئے ہیں جو کسی قدر رُوحانیت رکھتے تھے، تو ''بدھ'' اُن میں سے ہو سکتا ہے۔

سوال: سر! امام سلطان محمّد شاہ صلوات اللہ علیہ نے اُن کا ذکر کیا ہے کیا وہ اپنے وقت کے پیغمبر ہو سکتے ہیں؟

جواب: ہاں! وہ ہی بات ہے

سوال: سر! یہ مولانا رُوم بھی ظاہر میں اسماعیلی نہیں تھے۔

جواب: [مولانا روم بھی] ظاہر میں اسماعیلی نہیں تھے وہ شمس تبریزؒ کے مُریدوں میں سے تھے اِس لئے ہو سکتا ہے کہ شمس تبریزؒ نے اُن کو برملا دعوت کی ہو اور پھر اُن کو اسی مقام پر رکھا ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اُن کو بھید بھی بتایا ہو اور اسی Level کی اُن کو تعلیم دی ہو۔

سوال: ۔سر! حضرت امام حسنؑ سے امامت کہاں گئی؟ کس امامِ مستقر کو Continue ہوئی؟
جواب: ۔اُن کے بھائی [حضرت امام] حسینؑ کو۔

سوال: حضرت امام حسینؑ میں جو اِمامت آئی جو نور آیا وہ تو حضرت علیؑ سے آیا، امام حسنؑ سے نور کہاں سے آیا؟
جواب: اصل میں تواریخ جو آپ کو بتائے گی وہ Secondary قسم کی بات ہوگی، کیونکہ وہ تواریخ ہے اور جو حقیقت یا تاویل آپ کو بتائے گی وہ بات قرآن کے موافق ہوگی۔ اصل میں بات یہ ہے کہ حسنؑ اور حسینؑ کے معاملے میں عام قاعدے سے ہٹ کر کوئی بات ہے۔ مثلاً قرآن اسلام کا، ایمان کا اور حقیقت کا قانون ہے بحیثیتِ مجموعی، لیکن اگر اُس کے اندر ایک مخصوص آیت ہے تو وہ مخصوص آیت تمام قرآن پر اثر انداز ہو جاتی ہے، اور وہ عام قاعدے سے ہٹ کر ایک بات بن جاتی ہے۔ تو پنجتنِ پاک کے سلسلے میں آیۂ تطہیر (۳۳:۳۳) جو نازل ہوئی وہ ایک خصوصی چیز ہے، وہ عام قاعدے سے الگ اور مخصوص ایک بات بن جاتی ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ خداوندِ عالم نے فرمایا کہ ''میں نے اہلِ بیت کو جیسا کہ چاہئے پاک کر دیا ہے'' تو اس کا اطلاق محمدؐ، علیؑ، فاطمہؑ، حسنؑ اور حسینؑ بیک وقت اِن پانچ افراد پر اُس کا ہو جاتا ہے، اُس صورت میں حسنؑ میں کوئی کمی نہیں رہتی ہے۔ ایک چیز اور دُوسری چیز قرآن کے اندر یہ ہے۔ وَالسَّابِقُونَ السَّابِقُونَ أُولَئِكَ الْمُقَرَّبُونَ (۵۶:۱۰۔۱۱) جو سابق ہیں وہ سابق ہی ہیں اور وہ زیادہ نزدیک ترین ہیں، تو مطلب حضرت حسنؑ سابق ہیں عمر کے لحاظ سے، اِدھر پاک بھی ہیں پنجتن کے برابر اور اُدھر سابق ہیں تو اِس سابق ہونے کے لحاظ سے حسینؑ سے حسنؑ آگے ہو گئے، لہٰذا نور تو پانچوں میں تھا لیکن امرِ امامت، اختیار سب سے پہلے حسنؑ کو آ گیا، حسنؑ کی مدّت ختم ہوگئی، پھر اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ یعنی حسنؑ کا جانشین کون ہوا؟ اُس کے بیٹے ہوں یا بھائی ہوں، بھائی امامت کے لئے آیۂ تطہیر (۳۳:۳۳) کے لحاظ سے بالکل حقدار تھا لیکن ایک وجہ سے وہ امام نہیں ہوا تھا کہ حسنؑ کی عمر بڑی تھی اِس لحاظ سے حسینؑ کو امامت نہیں ملی تھی۔ جب یہ چیز سامنے سے ہٹ گئی تو اِس کی بنیاد پر امامت حسینؑ کو لوٹ گئی جو کہ حسنؑ کے ساتھ امام حسینؑ آیۂ تطہیر میں شریک تھا، جو ایک خصوصی چیز تھی۔ وَالسَّابِقُونَ السَّابِقُونَ (۵۶:۱۰) میں بھی وہ آگے تھا، اب حسنؑ کا بیٹا آیۂ تطہیر کا حصّہ نہیں تھا اور وہ امامت کا Candidate نہیں تھا، لہٰذا امامت حسینؑ کو چلی گئی۔ نور تو پہلے سے تھا امرِ امامت، اختیار حسینؑ کو چلا گیا۔ جب [امامت] حسینؑ کو چلی گئی تو پھر وہاں سے وہ سیدھی لائن پر آگے بڑھنے لگی اور پھر وہ حسنؑ کی اولاد کو امامت نہیں آئی، یہ بات ہے۔

اِس میں ہے کہ تمام لوگوں کو اُن کے اماموں کے ذریعے سے بلایا جائے گا اِس لفظ کے اندر یہ ہے کہ يَوْمَ نَدْعُو كُلَّ أُنَاسٍ بِإِمَامِهِمْ (۱۷:۷۱) اِس میں لوگوں کی تقسیم ہے، طبقات بتائے گئے ہیں یعنی ایسا نہیں کہ اِس میں سب لوگوں کو

اوّلین وآخرین کوسب کوایک کر کے کہا گیا ہوایسا نہیں ہے۔ اِس میں کچھ تصوّر ایسا دیا گیا ہے کہ ہر زمانے کے لوگوں کو اُن زمانے کے امام کے ذریعے سے بلالیا جائے گا۔ناس نہیں ہے ''اُناس'' ہے اُناس یعنی لوگوں کی تقسیم کو کہا جاتا ہے۔ یہ اُس طرح سے ہے جس طرح کہ بنی اسرائیل کے بارہ قبیلے تھے کہ ایک پتھر سے بارہ چشمے نکلے تو لوگوں کے ہر گروہ نے اپنے حصّے کے پانی سے پی لیا۔تو قَدْ عَلِمَ كُلُّ أُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ (۲:۶۰) لوگوں کے ہر گروہ نے اپنے پینے کی جگہ کو معلوم کرلیا، تو ''اُناس'' سے لوگوں کے الگ الگ ہونے کا تصوّر ہے اِس لئے ہم یہ کہیں گے کہ ہر زمانے کے لوگوں کو اُن کے امام کے ذریعے سے بلایا جائے گا۔ اِس میں بھی ایک اچھی دلیل ہے کہ ہر زمانے کے لوگوں کو ان کے پیغمبر کے ذریعے سے کیوں نہیں بلایا جائے گا کہ امام کے ذریعے سے بلایا جائے گا۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ پیغمبر کبھی ہوتا ہے اور کبھی نہیں ہوتا ہے اور امامؑ ہمیشہ سے ہوتا ہے، اِس لئے امامؑ ہی گواہ ہے خدا و رسول کی طرف سے، گواہی کے لئے اور یہ بتلانے کے لئے کہ تمہارے زمانے میں جو امام تھا تم نے اُس کو کیوں نہیں پہچانا۔ اُن سے پوچھنے کے لئے امامؑ ہی کے وسیلے سے بلایا جائے گا۔

ٹائپنگ: اکبر علی پروف: نسرین اکبر

استادِ بزرگوار علّامہ نصیر الدّین نصیرؔ ہونزائیؒ کا پُرحکمت بیان

عنوان: ایمان بالغیب، صفاتِ خداوندی

کیسٹ نمبر:۹ تاریخ:۱۹۷۷ء، کراچی

Click here for Audio

عبادت کے کئی طریقے ہیں۔ اُن میں سے کچھ عبادتیں علمی ہیں، کچھ فکری ہیں اور کچھ ذکری ہیں اور کچھ خیال اور تصوّر سے متعلّق ہیں۔ جو عبادتیں علمی ہیں اُن میں یہ ہوتا ہے کہ کوئی کُلیّہ ہوتا ہے یا کوئی کلمہ ہوتا ہے جو کہ ایک رُوحانی شخص کو پہلے سے بتا دیا ہوتا ہے، تو وہ کلمہ سامنے رکھتا ہے۔ اُس کو یا تو پڑھتا ہے یا اُس کی طرف دیکھتا رہتا ہے تو اُس وقت اُس میں سے علم کی روشنی پیدا ہوتی ہے، اُس سے پھل گرتا ہے، علم کا پھل، حکمت کا پھل تو پھر وہ پھل چنتا رہتا ہے۔ وہ اپنے لئے اُس میں سے علم کا، معلومات کا ذخیرہ بنالیتا ہے۔ یہ ایک ایسی عبادت ہے جو عملی ہے اور اُسی وقت اُس کا ثمرہ ملتا رہتا ہے۔ اِس کے علاوہ بعض دفعہ شکرگزاری کی عبادت ہوتی ہے، اُس میں ہم ہر ہر نعمت کا تصوّر کر کے اُس پر شکرگزاری کرتے ہیں اور جتنی بھی نعمتیں ذہن میں آئیں، یاد میں آئیں اُن تمام نعمتوں کو پیشِ نظر رکھتے ہیں، خداوندِ عالم کے حضور میں گڑگڑاتے ہوئے مناجات کرتے ہیں، شکرگزاری کرتے ہیں، یہ شکرگزاری کی عبادت ہے۔ بعض دفعہ کوئی مناجات ہوتی ہے یعنی ہم اپنے پروردگار سے گفتگو کے انداز میں، دُعا کے انداز میں، فریاد کے انداز میں درخواست کرتے ہیں، عبادت کرتے ہیں اور یہ مناجات ہے۔

اِس کے علاوہ پھر سجود اور دُعائیں مانگنے کی عبادت ہوتی ہے اور اکثر ہم اپنی زبان میں عبادت کرتے ہیں۔ اِس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ ہم تقلیدی عبادت سے گزر کر اپنی تکلیف کی عبادت کرتے ہیں یعنی اُس میں اپنی عقل، اپنی منطق پر زور دیتے ہیں اور جس کی وجہ سے ہماری توجہ ربُّ العزت کی طرف ہوتی ہے یا اُس مناجات کی طرف ہوتی ہے، اُس عبادت کی طرف ہوتی ہے، یعنی ہمیں خود الفاظ بنانے پڑتے ہیں، باتیں خود بنانی پڑتی ہیں، جو ہماری حالت کے مطابق ہوتی ہیں اور ہمارے دل کی کیفیت کی ترجمانی ہوتی ہے، صحیح صحیح ترجمانی اور اسی طرح عبادت ہوتی ہے۔ بعض دفعہ کوئی شک نہیں [ہوتا] کوئی اسم کا ورد ہوتا ہے اور اسماء میں سے کوئی بھی اسم ہوتا ہے یعنی بہت سے اسماء رُوحانیت میں دیئے ہوئے ہیں، تو اُن میں سے کسی ایک اسم کو لیتے ہیں اور اُس اسم کے انتخاب کے لئے ہم یہ دیکھتے ہیں کہ بعض دفعہ وہ

خود بخود ہمارے ذہن کی سطح پر وہ اِسم اُبھرتا ہے، جس کو اُن دنوں میں ذکر کرنا چاہئے اور بعض دفعہ ہم خود سوچ کر کسی اِسم کا انتخاب کرتے ہیں اور بعض دفعہ ہم ایک اِسم کی بجائے چند اسماء کو لیتے ہیں اور اسی طرح عبادت کا حصّہ ہوتا ہے۔

لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ اکثر ہم کام کو ترجیح دیتے ہیں لکھنے کے لئے بہترین وقت ہمارا رات کا وقت ہے۔ اُس میں ہم کو بہت ہی زیادہ سکون ملتا ہے۔ آپ باور کریں جتنا سکون ذکر و عبادت سے ملتا ہے اُس سے بڑھ کر ہم کو کام سے ملتا ہے۔ جب ہم کوئی اچھا مضمون لکھتے ہیں تو اُس وقت ہم مولا کے حضور کی طرف بہت ہی توجّہ کرتے ہیں، اور سب سے پہلے تھوڑی سی عبادت کرتے ہیں، پھر سجدہ کرتے ہیں، پھر ہاتھ اُٹھا کر دُعا مانگتے ہیں اور پھر سجدہ کر کے مولا سے یاری چاہتے ہیں اور اگر ہو سکے تو آنکھوں کو تر کرتے ہیں، ہو سکے تو آنسو بہاتے ہیں زیادہ نہیں تو تھوڑے سے پھر اُس کے بعد لکھنے کے لئے بیٹھتے ہیں تو اُس وقت جب مولا کی رحمت اُس کام کی طرف متوّجہ ہوتی ہے تو اُس کے ذریعے سے ہمارے دل کو سکون اور راحت آتی رہتی ہے۔ وہ راحت اِس قدر زیادہ ہے کہ وہ ذکر اور عبادت سے بڑھ کر ہوتی ہے۔ پھر جب کوئی اچھا کام بن گیا اور صبح سویرے [جب] ہمارا موڈ اِس طرح سے خوب [اچھا] ہوتا ہے جس طرح سے ذکر و عبادت سے ہوتا ہے تو پھر ہم خرماو ہم ثواب والی بات ہوتی ہے کہ ہم نے کھجور بھی کھالیں اور ثواب بھی مل گیا۔ نیک کام بھی ہو گیا اور عبادت بھی ہو گئی اور چونکہ مولا کا فرمان بھی یہی ہے کہ ''عبادت سے قوم کی خدمت بہتر ہے'' ۔ اس کے الفاظ تقریباً یہی ہیں کہ قوم کی خدمت ہزار سال کی عبادت سے بڑھ کر ہے۔ وہ اِس معنی میں ہے کہ اِس خدمت سے سب کو فائدہ ملنے والا ہے اور ہم تسبیح کی عبادت کریں گے تو وہ انفرادی چیز ہے۔ جیسے ایک شخص اپنے گھر میں دروازے کو بند کر کے خوب کھانا کھاتا ہے تو اس سے لوگوں کو کیا فائدہ؟ اس کی شخصیت کو فائدہ ہے۔ اسی طرح اگر ہم کچھ خدمت کر سکتے ہیں تو تقاضا یہ ہے کہ ہم زیادہ سے زیادہ خدمت کریں۔ اپنے مفاد کو دُوسروں کے مفاد پر قربان کر دینے کہ معنی یہ ہیں کہ اپنے فائدے کے لئے نہیں سوچنا چاہئے۔ نجات ملنی ہے تو مل جائے گی اِس خدمت کے طفیل سے اور نہیں ملنی ہے تو دیکھا جائے گا۔ تو بہر حال اُن جماعتوں کی دعائیں بھی کچھ کام کریں گی جن کو آگے چل کر اس کام سے خوشی اور خوشنودی ہو گی، یہ بات تھی۔

اور اس کے علاوہ آپ نے زکات کی بات کے بارے میں پوچھا تھا وہ یہ کہ سب سے اوپر کا درجہ عقلِ کُل ہے، وہ دیتا ہے اور کہیں سے زکات نہیں لیتا یعنی عقلِ کُل وہ درجہ ہے جو زکات دیتا ہے اور کسی سے نہیں لیتا، اور نفسِ کُل وہ درجہ ہے جو عقلِ کُل سے زکات لیتا ہے اور ناطق کو زکات دیتا ہے۔ ناطق نفسِ کُل سے زکات لیتا ہے اور اساس کو زکات دیتا ہے، اساس امام کو علمی زکات دیتا ہے اور ناطق سے لیتا ہے، امام، باب کو علمی زکات دیتا ہے اور اساس سے لیتا ہے، باب یعنی

حجتِ اعظم جزیرہ والے حجت کو علمی زکات دیتا ہے اور جزیرے کا حجّت بڑے داعی کو علمی زکات کو دیتا ہے، بڑا داعی چھوٹے داعی کو علمی زکات دیتا ہے، چھوٹا داعی بڑے ماذون کو علمی زکات دیتا ہے اور چھوٹا ماذون مستجیب کو علمی زکات دیتا ہے۔ اور مستجیب وہ ہے جو زکات لیتا ہے اور کسی کو زکات دے نہیں سکتا۔ یعنی وہ علم کو حاصل کرتا ہے لیکن فی الوقت کسی کو علم نہیں دے سکتا ہے، اور زکات کے معنی پاکیزگی کے ہیں۔ تو اِس زکات کے دینے میں پاکیزگی ہوتی ہے اور اوپر کے جتنے حدود ہیں ان کی علمی طور پر پاکیزگی ہوتی ہے، سوائے مستجیب کے کہ اُس کی پاکیزگی کے لئے ابھی وقت باقی ہے۔ کیونکہ وہ علمی زکات کسی کو نہیں دے سکتا ہے۔ جب وہ اِس قابل ہو جائے [گا] کہ وہ دُوسروں کو علمی زکات دے سکے، تو اُس وقت اُس کی بھی پاکیزگی ہو جائے گی۔ چونکہ زکات کے معنی پاکیزگی کے ہیں اور میں نے کہا تھا کہ زکات دو قسم کی ہے، ایک علمی زکات ہے اور ایک مالی یا مادّی زکات ہے، تو مادّی یا کہ ظاہری مال کی زکات کے بارے میں آپ کو خوب علم ہے، اس لئے میں نے علمی زکات کا ذکر کیا۔ تو یہ حدود ایسے ہیں کہ اُن میں سے ہر ایک کی دو دو حیثیتیں ہیں۔ اُوپر کی حد کے لحاظ سے اُن کی حیثیت الگ ہے اور نچلی حد کے اعتبار سے اُن کی مرتبت الگ ہے۔ میں یہی کچھ عرض کرنا چاہتا تھا۔

سوال: اس کے اندر Circle نہیں ہو سکتا ہے؟

جواب: Circle ہے، وہ Circle جو ہے وہ دُوسرے علم میں ہے یہ ترتیب ہے، اِس ترتیب میں Circle نہیں ہے اور توحید میں Circle ہے توحید کا بیان اور اِس کا علم اس سے الگ ہے۔ لہٰذا اُس کا بیان الگ کریں گے۔

سوال: سر! یہ نفسِ کُل اور عقلِ کُل میں کیا فرق ہے؟

جواب: اس میں فرق یہ ہے کہ عقلِ کُل قلم کے درجے پر ہے اور نفسِ کُل تختی کے درجے پر ہے، اِس لئے عقلِ کُل کو قلمِ الٰہی کہا جاتا ہے اور نفسِ کُل کو لوحِ محفوظ کہا جاتا ہے۔ یہ آپ جانتے ہیں کہ قلم لکھتا ہے اور تختی اُس تحریر کو قبول کرتی ہے اور دُوسرے لحاظ سے عقلِ کُل عرش ہے، خدا کا تخت اور نفسِ کُل وہ Stage ہے جو تخت کے نیچے کا چبوترا وغیرہ جیسی بات ہے۔ اور ایک اور لحاظ سے عقلِ کُل حقیقی آدم ہے اور نفسِ کُل حقیقی حوّا ہے۔

سوال: سر! یہ کہتے ہیں کہ آدم میں سے حوّا پیدا ہوئی تو اِس کی کیا توجیہہ ہے؟

جواب: اس کی تاویل یہ ہے کہ عقلِ کُل سے نفسِ کُل پیدا ہوا اور اِس کی تاویل یہ ہے کہ امام سے حجّت پیدا ہوا۔ اس کی

تاویل یہ ہے کہ ناطق سے اساس کی شخصیت، علمیت پیدا ہوئی۔ ہر اُو پر کی حد سے نچلی حد پیدا ہوتی ہے ورنہ دُنیا میں کوئی عورت اپنے شوہر سے پیدا نہیں ہوئی اور جو یہ کہا جاتا ہے کہ آدم کی بائیں پسلی سے حوّا پیدا ہوئی تو اُس کے معنی یہ ہیں کہ آدم کے چوبیس (۲۴) حجّت تھے اُن میں سے ایک حجّت کو اساس کا درجہ دیا گیا۔

سوال: سر! آپ نے عقلِ کُل اور نفسِ کُل کے بارے میں بتایا تھا کہ عقلِ کُل علم دینے والا ہے اور نفسِ کُل رحمت کا [سرچشمہ ہے]۔
جواب: ہاں، اِس تقسیم میں جہاں علم اور رحمت کا سوال ہوتا ہے تو علم کا سرچشمہ عقل ہے اور رحمت کا سرچشمہ نفس ہے۔

سوال: سر! نفس کے لفظی معنی کیا ہیں؟
جواب: یہاں رُوح کے معنی ہیں۔

سوال: [ایسا کیوں ہے کہ صرف ایک ہی خاندان میں امامت محدود ہے؟]
جواب: انہوں نے پوچھا کہ ایسا کیوں ہے کہ صرف ایک ہی خاندان میں امامت محدود ہے مثلاً خاندانِ ابراھیم میں یا خاندانِ محمّد میں، اِس کی کیا وجہ ہے؟ تو اِس کی وجہ یہ ہے کہ اِس دَورِ عظیم کے اندر ایسا ہونا چاہئے کہ امامت ایک ہی خاندان سے ہو، اور خداوندِ عالم کی طرف سے جس کو ایک عظیم عطیہ ملے تو وہ مکمل عطیہ ملنا چاہئے۔ بلکہ اِس کا مطلب یہ ہے کہ ازل اور ابد میں جو وقت ہے وہ اتنا بے پایان ہے، وہ اِس قدر بے پناہ ہے کہ اُس میں ہر مومن کے لئے موقع فراہم کیا گیا ہے کہ ہر مومن کو یہ موقع دیا جائے۔ جیسا کہ امامؑ نے فرمایا کہ تم فلان پیر کی طرح ہو کے آؤ بلکہ خود میری طرح ہو کے آؤ۔ اِس سے یہ سوال ختم ہو جاتا ہے یعنی اِس سوال کے اندر ایک چھوٹی سی شکایت تھی یا بڑی شکایت تھی کہ کیوں ایسا ہے کہ امامت یعنی رُوحانی فضیلت ایک خاندان میں محدود ہے، حالانکہ امامؑ کے جو خاص فرامین ہیں اُس کے اندر ایسا نہیں ہے اُس کے اندر رُوحانی آزادی کا ذکر ہے۔ ابھی ابھی کچھ خاص فرامین ہمارے ہاتھ آئے ہیں جن کو ہمارے عزیز دوست پرویز صاحب نے بھی پڑھا اور اُس کی کاپیاں بنائی گئیں ہیں۔ امامؑ فرماتے ہیں کہ تم ایسا خیال مت کرو کہ خاندانِ ابوطالب میں امامت اور رُوحانی فضلیت محدود ہے، یہ تو سب مومنین کے لئے ہے تاہم بظاہر امامت جو ہے وہ پھر بھی اِس دفعہ اِس دورِ

عظیم میں صرف ایک خاندان کے لئے ہے اور دُوسرے دَور میں اور دوسرے سیّارے پر اور دُوسرے Turn میں ہر شخص اسی عظیم مرتبے پر فائز ہو کے کسی دُنیا میں زندگی گزار سکتا ہے۔

اِس کے معنی یہ ہوئے کہ وقت بے پایان ہے، وقت بے پناہ ہے، اِس بے پناہ وقت میں ہر ایک کے لئے موقع فراہم کیا گیا ہے۔ اگر وقت محدود ہوتا اور اِس دفعہ کی زندگی کے بعد پھر جسمانی زندگی میسّر نہیں آتی تو پھر یہ سوال تھا وہ بجا ہوتا اور یہ جو شکایت تھی یہ صحیح ہوتی۔ کیوں ایسا ہے کہ خداوندِ عالم نے صرف ایک ہی خاندان کو اتنی عظیم فضیلت دی ہے اور دُوسرے سب انسانوں کو اس سے محروم رکھا گیا ہے۔ قرآن کے اندر جو لطیف اشارے ہیں اُن کی گہرائی میں جانے سے خداوندِ عالم کی طرف سے کوئی شکایت نہیں ہو سکتی ہے، کوئی گلہ باقی نہیں رہتا ہے۔ بہت مواقع ہیں، بے پناہ وقت ہے اور بے پایان زمانہ ہے، یہاں تک کہ خدا کی خدائی کے لحاظ سے وقت کی لاانتہائی کا جو تصور ہے [وہ] خدا کی خدائی کے لحاظ سے ہے، مثلاً کوئی سوال کرے کہ خدا کی خدائی کب سے ہے؟ اور کب تک رہے گی؟ اِس میں تو ''کب سے اور کب تک'' سے اور تک خدا کے لئے نہیں آتا ہے۔ تاہم اِس سوال کے اندر وقت کی لاانتہائی کا تصوّر ضرور ہے یعنی بہت زیادہ وقت ہونے کا تصوّر ہے۔ تو یہی تصوّر رُوحوں سے متعلّق ہے یعنی رُوحوں کے لئے بھی اتنا بڑا وقت ہے جتنا کہ خدا کی خدائی کے لئے ہے۔ کوئی کہہ سکتا ہے کہ خدا کی خدائی ایک محدود زمانے کے لئے ہے، کون کہہ سکتا ہے۔ اگر ایک انسان تھوڑی سی عقل رکھتا ہے تو پھر بھی وہ اِس سے انکار نہیں کر سکے گا کہ خدا کی خدائی ایک محدود وقت کے لئے ہے۔ خدا کی خدائی اُس کی سلطنت و بادشاہی تو ہمیشہ کے لئے ہے، وہ ہمیشہ کے لئے ہے۔ تو دانشمندوں کے لئے خدا ہی کا تصوّر ایک ایسا تصوّر ہے جس کی روشنی میں ہر بات کا فیصلہ ہو جاتا ہے، ہر بات سے متعلّق مسئلہ طے ہو جاتا ہے۔ خدا کے تصوّر کے بغیر کوئی مسئلہ حل نہیں ہوتا ہے، زمان کے بارے میں، مکان کے بارے میں اور دائمیت کے بارے میں، لاانتہائی کے بارے میں، ہر چیز کے بارے میں۔ لہٰذا خدا نے اُن تمام اوصاف کو اپنا لیا ہے، حالانکہ وہ اوصاف خدا کے نہیں ہیں، کامل انسانوں کے اوصاف ہیں، رحیم، کریم، خالق، رزّاق، علیم، عدیل یہ سب کامل انسانوں کی صفات ہیں، اوصاف ہیں۔ اِن میں سے معنی اور حکمت ظاہر کرنے کے لئے، اِن کو اعلیٰ سے اعلیٰ سطح تک پہنچانے کے لئے خدا نے کہا کہ یہ میری صفات ہیں، تاکہ لوگوں کو یقین ہو کہ یہ جو صفات ہیں قدیم ہیں یعنی دائمیت کی صفات ہیں، ہمیشگی کے لئے ہیں اور اگر دیکھا جائے تو خدا صفات سے بے نیاز ہے، جیسا کہ میں نے کبھی کہا تھا کہ اِن صفات میں سے ہر صفت کا ایک Opposite ہے۔ آپ خدا کو نور کیسے کہہ سکتے ہیں؟ اگرچہ قرآن میں خدا کے لئے نور کہا گیا ہے، لیکن یہ ایک Stage کی تعلیم ہے، آخری تعلیم نہیں ہے، اِس لئے کہ خدا نور نہیں

ہے۔اگر ہم خدا کو نور کہیں گے تو اُس کا ایک مدِّ مقابل قرار پائے گا جو نور نہیں ہوگا بلکہ اُس کا Opposite ہوگا اور وہ Opposite کیا ہے؟ نور کا تقاضا ہے کہ ظلمت ہو تو پھر نور ہوگا، شناخت کے لحاظ سے بھی کہ ہر چیز کی شناخت اُس کی ضد سے ہوتی ہے اور کام کے لحاظ سے بھی کہ ہر چیز کا کام اُس کی ضد سے تالی سے ہوتا ہے، اس کی ضد سے کام ہوسکتا ہے۔مثلاً سردی گرمی کے خلاف کام کرتی ہے اور گرمی سردی کے خلاف ہے، بلندی کا تصوّر پستی سے ہے، امیری غریبی کے خلاف ہے اور غریبی پر امیری کی شناخت ہے۔اسی طرح نور کی شناخت ظلمت سے ہے اور نور کا کام بھی ظلمت کے خلاف ہے اور ظلمت کا کام نور کے خلاف ہے، تو اِس کی منطق یہ ہوئی کہ خدا کا کوئی مخالف ہے، جو مخالفت کرتا ہے اور خدا اُس کے برعکس کام کرتا ہے۔یہ بات نہیں ہے، پھر تو خدا کی خدائی آدھی کائنات میں ہوئی اور آدھی کائنات میں دُوسرے کی خدائی ہوئی۔یہ تو آتش پرستوں کا تصوّر رہا جو کہتے ہیں کہ دو خدا ہیں، ایک بُرائی کا ایک بھلائی کا، بُرائی کا خدا یزدان اور بھلائی کا خدا اہرمن یعنی شیطان ہے، یہ بات نہیں ہے۔

لہٰذا اِن تمام صفات کو آپ انسانِ کامل کے لئے چھوڑیں۔اور انسانِ کامل کی ضد ہے، اُس کا مخالف ہے، ہم شیطان کو ہادیٔ برحق کے مدِّ مقابل قرار دیں تو اچھا ہے، بجائے اِس کے کہ ہم شیطان کو خدا کے مدِّ مقابل قرار دیں اور ہاں اِس میں کوئی شک نہیں کہ خدا نے شیطان کو دُشمن قرار دیا ہے۔لیکن اِس معنی میں کہ شیطان کوئی ایسا شخص ہے جو اُس کے رسول کا دُشمن ہے اور اُس کے جانشین امام کا دُشمن ہے۔تو اِس نسبت سے وہ خدا کا دُشمن ہے لیکن ذاتی طور پر خدا کا یہ دُشمن نہیں ہے، یہ خدا کی مخلوق ہے۔جس طرح آپ کے دوست کا دُشمن آپ کا دُشمن ہے، تو پیغمبر اور امام خدا کے دوست ہیں اُن کی دوستی کی بناء پر خدا نے اُن کے دُشمنوں کو اپنا دُشمن قرار دیا ہے۔جیسا کہ حدیث شریف میں ارشاد ہے کہ پیغمبرؐ نے فرمایا تھا کہ: اَللّٰھُمَّ وَالِ من وَالاہُ وَعَادِ مَن عَادَاہُ ''اے بارِ خدایا! علی سے جو دوستی رکھے تو اُن سے دوستی رکھنا اور جو علی سے دُشمنی رکھے تو اُن سے دُشمنی رکھنا'' (مشکوٰۃ المصابیح، حصہ چہارم، حدیث نمبر ۵۴۸)، اور واقعتہً ایسا ہی ہے کہ امامؑ کے جو دُشمن ہیں وہ خدا کے دُشمن ہیں، پیغمبر کے جو دُشمن ہیں وہ خدا کے دُشمن ہیں۔تو اِس سے ثابت ہوا کہ شیطان خدا کا دُشمن نہیں ہے Directly، وہ ایک ایسا شخص ہے جو پیغمبرؐ کا دُشمن ہے اور زمانے کے امامؑ کا دُشمن ہے اور ہاں اِس وجہ سے وہ خدا کا بھی دُشمن ہے۔

میں یہ کہہ رہا تھا کہ خدا کے لئے کوئی ایسی صفت واجب نہیں، لازم نہیں جس کے مقابلہ میں ضد پائی جائے۔جس طرح میں نے کبھی کہا تھا کہ عادل، خدا عادل نہیں ہے۔اگر آپ خدا کو عادل قرار دیں تو اُس کے مقابلے میں ایک ظالم کا

تصوّر پایا جائے گا اور ظالم ظلم کرتا چلا جائے گا اور خدا اُس کے مقابلے میں عدل کرتا چلا جائے گا، یہ بات صحیح نہیں ہے۔ ہاں! یہ بات صحیح ہے کہ پیغمبر عادل ہے اور امامؑ عادل ہے۔ کیونکہ پیغمبر کے مقابلے میں کوئی دُشمن بھی ہے اور امامؑ کا بھی اسی طرح کوئی مخالف ہے لیکن خدا کے برابر کا کوئی دشمن نہیں ہے نہ اُس کے برابر کا کوئی مخالف۔ تو یہ ہے خدا کی صفات کے بارے میں۔

انہوں نے ایک سوال کیا، میرے خیال میں یہ اہم سوال ہے۔ یہ ایمان بالغیب کا سوال کرتے ہیں یعنی عالمِ اسلام میں اِس بات کی کیوں اہمیت ہے جو کہا جاتا ہے: يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ (۳:۲) اور اسی سے ہمارے اثنا عشری بھائی امامؑ کے غائب ہو جانے کا ثبوت پیش کرنا چاہتے ہیں [یا] پیش کرتے ہیں۔ اِس کے لئے یہ ہے کہ غیب کا مطلب دل کی کیفیت ہے یعنی سب سے پہلے ایمان بالغیب کی بات کریں گے وہ یہ کہ غیب کی حالت میں ایمان لانے کے یہ معنیٰ نہیں ہیں کہ اِس میں خدا کو بِن دیکھے ایمان لانا ہے۔ بلکہ اِس کے معنیٰ یہ ہیں کہ ہم [جو] ظاہر سے بڑھ کر باطن میں، دل کی کیفیت میں جو ایمان لاتے ہیں اُس کی بہت بڑی اہمیت ہے۔ خدا پر ایمان لانا ہو یا آخرت پر تقویٰ ہو یا عبادت ہو جو بھی عملِ صالح ہو وہ بنیادی طور پر دل کی کیفیت میں ہونے چاہئے۔ جب دل سے ہم ایمان لائیں گے تو پھر سوال نہیں پیدا ہوتا ہے کہ ہماری زبان پر ایمان نہ ہو یا ہمارے اعمال میں ایمان کا اثر نہ ہو۔ تو اِس معنیٰ میں خداوندِ عالم زبانِ حکمت سے یہ فرماتے ہیں کہ تم دل سے ایمان لاؤ، نہ کہ لوگوں کے سامنے۔

جس طرح قرآن میں ہے کہ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو کہ ایمان والوں سے ملتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم نے ایمان لایا، جب شیاطین سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ [وَإِذَا لَقُوا الَّذِينَ آمَنُوا قَالُوا آمَنَّا وَإِذَا خَلَوْا إِلَىٰ شَيَاطِينِهِمْ قَالُوا إِنَّا مَعَكُمْ إِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِئُونَ (۱۴:۲)] اِس کی وجہ یہ ہے کہ وہ دل سے ایمان نہیں لاتے ہیں اور [اگر] دل سے ایمان لاتے تو یہ شکایت نہ رہتی کہ یہاں کچھ اور کہیں اور وہاں جا کر کچھ اور کہیں، اور یہ کہ امامؑ کے بارے میں اِس غیب کے مسئلے کو کیوں اُلجھائیں، اگر امامؑ کے بارے میں قرآن میں کوئی صریح ذکر نہیں ہوتا تو کسی حد تک یہ تصوّر ٹھیک تھا لیکن جب امامؑ کے بارے میں مُبین [(۱۲:۳۶)] کا لفظ آیا ہے اور امامؑ [دنیا میں] ہدایت کے لئے ہے اور پیغمبر ظاہر تھے اور پیغمبر اور امامؑ کے بغیر خدا تک رسائی آسان نہیں ہے، بلکہ ناممکن ہے، تو لہٰذا دُنیا میں پیغمبروں کے آنے کی ضرورت ہوئی اور امام پیغمبروں کا جانشین ہے۔ تو پھر امام کو پیغمبر کی طرح ہونا چاہئے اور لوگوں کے سامنے ہونا چاہئے، امامت کا تصوّر نبوت سے کچھ الگ تو نہیں ہے، جسمانیت کے لحاظ سے، حاضر ہونے کے لحاظ سے، ہستی کے لحاظ سے اور کام

کے لحاظ سے [بھی] ،تو جو بھی ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبروں میں سے دُنیا میں آئے ظاہر ہو کے کام کیا اور حضورِ اکرمؐ نے لوگوں کے سامنے کام کیا۔ جب وہ دُنیا سے رحلت کر گئے گویا کہ لوگوں کی نظروں سے وہ غائب ہو گئے تو اُس وقت ایک دم سے مسلمانوں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ اُن کے جانشین کا کیا کیا جائے؟ اگر پیغمبر کا لوگوں کی نگاہوں سے غائب ہو جانے میں کوئی حرج نہ ہوتا تو پھر اِس کے لئے اہتمام ہی نہ کرتے ، پھر بعد میں کس طرح یہ تصوّر قائم کیا گیا۔ رسول اللہؐ کے زمانے میں اور اُن کی رحلت کے بعد یہ تصوّر نہیں تھا۔ اگر ایسا کوئی تصوّر ہوتا تو سب مسلمان مل کر یہ طے کرتے کہ اب کسی خلیفہ کی کسی امام کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہی ہے، چونکہ پیغمبر اپنے نور میں غائب ہیں اور خدا بھی اپنی تمام تر قدرتوں کے ساتھ غائب ہے اور یہ غائب خدا اور غائب پیغمبر ہم کو ہدایت کریں [گے] ۔ یہ تصوّر بعد میں گڑھا گیا اور جب اُن کے لئے کوئی دلیل باقی نہیں رہی تو مجبوراً اُن کو یہ کہنا پڑا کہ اب امام غائب ہے۔

عزیزانِ من! <u>چوبیس گھنٹے خداوند کی یاد میں رہنے سے اور ہمیشہ ذکر کرنے سے کامیابی ہوتی ہے</u> ۔ کیونکہ ہم دن رات کس طرح سوچتے ہیں؟ ہم کس طرح خیال کرتے ہیں؟ اور جس طرح ہمارے اعمال ہوتے ہیں، اُس کے نتیجے کے مطابق صبح کی عبادت انجام پاتی ہے۔ وہ نتائج اُس میں مُخل ہو جاتے ہیں، وہ نتائج اُس نورانی عبادت میں اثر انداز ہو جاتے ہیں۔ یہ آپ کے Notice میں رہے، یہ آپ کے خیال میں رہے۔ ایسا نہیں کہ جو آپ اُس ایک گھنٹے کے اندر چاہیں وہ ہو پائے، جو آپ چوبیس گھنٹے کے اندر کرتے ہیں اُس کا بھی دخل ہے۔ آپ کے اعمال جیسے ہیں ویسی عبادت ہو پائے گی۔ آپ اگر رُوحانی ترقی چاہتے ہیں تو اس کے لئے ہمیشہ نیکی کریں ، اور نیک بنیں اور دل میں نیک خیالات کو جاگزین کریں، پھر ان شاء اللہ کامیابی ہوگی۔ اِس کے لئے آپ کو <u>دائم الذّکر</u> ہونا ہے، دائم الذّکر کا مطلب یہ ہے کہ آپ اسمِ اعظم کے موتی کو ہمیشہ منہ میں رکھیں، اسمِ اعظم کے پُرحکمت موتی کو منہ میں رکھیں، زبان کے نیچے رکھیں، دل میں رکھیں، دماغ میں رکھیں یعنی کہ خداوند کے مبارک نام کو جاری و ساری رکھیں ۔ ہر وقت اُس کو جپتے رہیں، ہر وقت اُسکا نام بولتے رہیں، پڑھتے رہیں جلی بھی، خفی بھی ، ظاہر بھی، باطن بھی اور ہر صورت میں، ہر طور سے اُس مبارک نام کو یاد کریں پھر اِس کے نتیجے میں اِس کی برکت سے آپ کا جو ذکر ہے وہ آگے بڑھے گا اور وہ [یاد] پُر رونق ہوگی ، اُس سے لذّت اور خوشی محسوس ہونے لگے گی اور اُس لذّت و خوشی کے اثر سے آپ ذکر میں باقاعدہ رہیں گے اور روز بروز آپ کا ذکر آگے سے آگے بڑھے گا۔

ایک دن آپ کو روشنی دیکھنا نصیب ہوگی اور پھر جب آپ روشنی دیکھیں گے تو بہت ہی خرسند و شادمان ہو جائیں

گے، آپ کو بہت ہی خوشی ہوگی۔ پھر اُس کے بعد ان شاءاللہ یہ کام آگے سے آگے بڑھے گا۔ اَس کے لئے ہمّت درکار ہے، پاک دلی چاہیئے، پاکیزگی چاہیئے، تقویٰ، نیکی اور مومنی کی صفات [درکار ہیں]۔ دُنیا میں بھی دو شخص آپس میں دوستی اُس وقت کر سکتے ہیں جبکہ وہ کسی نہ کسی بنا پر آپس میں مناسبت رکھتے ہوں، اگر اُن کی طبیعتیں الگ الگ ہیں تو دوستی کبھی نہیں ہوتی ہے اور اُن میں کوئی مشابہت نہ ہو، کوئی رشتہ نہ ہو یا زبان کا رشتہ یا قومیت کا رشتہ یا کسب و ہُنر کا رشتہ، کچھ بھی تو رشتہ ہونا چاہیئے تاکہ دوستی ہو سکے، اِس کے بغیر کوئی دوستی نہیں ہوتی ہے۔ چنانچہ خدا کے ساتھ دوستی بھی اِس بنا پر ہو سکتی ہے کہ خدا کی صفات میں سے کچھ کچھ [صفات] آپ میں موجود ہوں، خدا کی خوبیوں میں سے کچھ کچھ [خوبیاں] آپ میں پائی جائیں، بڑے پیمانے پر نہیں کچھ خدا کی خوبیاں آپ میں پیدا ہوں، تو پھر خدا کے ساتھ دوستی ہوگی۔ سمندر کے ساتھ قطرے کی دوستی ہو سکتی ہے، مقدار کی کوئی بات نہیں ہے، سمندر عظیم ہے اور قطرہ حقیر ہے لیکن اِن دونوں کے درمیان ہم جنسیت اور رشتہ پایا جاتا ہے، وہ بھی پانی اور یہ بھی پانی، وہ عظیم بے پناہ سمندر ہے اور یہ بہت چھوٹی مقدار میں ہے، اِس کی کوئی بات نہیں ہے دوستی ہوگی، ذات ایک ہے، صفات ایک ہے اور رشتہ ایک ہے تو قطرے کی دوستی سمندر سے ضرور ہوگی۔

اِس مثال پر اگر خداوند ایک نور ہے تو آپ کے دل میں ایمان کی تھوڑی سی روشنی ہونی چاہیئے تو اُس نور کے ساتھ اِس روشنی کی دوستی ہوگی۔ اگر خداوند رحیم اور رحمان ہے تو آپ کے دل کے اندر تھوڑا سا رحم، شفقت اور مہربانی ہونی چاہیئے تاکہ خداوند کی عظیم رحمت اور آپ کے تھوڑے سے رحم کی آپس میں دوستی ہو۔ اسی طرح ہر صفت کی یہی مثال ہے کہ جو صفات خدا کی ہیں اُن میں سے ایک چھوٹا چھوٹا نمونہ آپ میں ہونا چاہیئے تاکہ خدا کے ساتھ آپ کی دوستی اور محبت ہو۔ اگر ایسا نہ ہو، آپ کی صفات، خدا کی صفات کے برخلاف ہوں تو پھر کبھی دوستی نہیں ہو سکتی ہے۔ پانی کے ساتھ آگ کی دوستی نہیں ہوتی، تاریکی کے ساتھ روشنی کی دوستی کبھی بھی نہیں ہوتی، امیری کے ساتھ غریبی کی کبھی دوستی نہیں ہوتی، یہ ضد ہے، Opposite ہے، تو دو Opposite چیزوں کی باہمی دوستی نہیں ہو سکتی ہے۔

اور کیوں نہ ہو اسی معنی میں اسماعیلی مذہب کی تعلیم ہے کہ امامؑ فرماتا ہے کہ تم آج میرے فرزند بن کر میری اطاعت کرو تاکہ فردا قیامت میں، میں تم کو اپنے بھائی کا درجہ عطا کروں گا۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ مومن بھی ایسا عظیم المرتبت اور ایسا عالیشان ہو سکے گا جیسے امامؑ ہیں۔ امامؑ کے اِس ارشاد کا مطلب یہ ہے اور حدیثِ قدسی کا بھی یہی مطلب ہے۔ حدیثِ قدسی میں فرمایا گیا ہے: یَابْنِی اٰدَمَ اَطِعنِی اَجعَلُكَ مِثلِی حَیًّا لَا تَمُوتُ وَ عَزِیزًا لَا تَذِلُّ وَ غَنِیًّا لَا تَفتَقِرُ۔ اے ابن آدم! تو میری اطاعت کر، تاکہ میں تجھ کو اپنی مانند بنالوں گا، ایسی زندگی عطا کروں گا کہ تو کبھی نہیں مرے گا، ایسی امیری

دوں گا کہ تو کبھی غریب نہیں ہو جائے گا اور ایسا معزز بناؤں گا کہ تو کبھی ذلیل نہ ہوگا۔ اِس میں مومن کے خدا کی صفات میں منتقل ہو جانے کا ذکر ہے۔ مومن کے خدا کی صفات میں منتقل ہو جانے کی بُشارت ہے۔ کتنی خوشی کی بات ہے! کہاں وہ جنّت جس کے معنی باغ کے ہیں اور کہاں یہ فضیلت کہ خدا کے مرتبے تک کوئی پہنچے، خدا سے واصل ہو جائے یعنی اُس وقت اس کا شُعور ایسا ہو کہ وہ خود کو خدا پائے، خود کو خدا دیکھے، خود کو خدا سمجھے۔

خدا دو نہیں ہو سکتے وہی ایک خدا [ہے] جو ازل اور ابد [میں] ہمیشہ قائم و دائم ہے۔ مطلب اِس کا یہ ہے کہ ہماری یہ زندگی ایک قید کی حیثیت سے ہے، ہماری یہ زندگی رُوح کی گرفتاری ہے، اِس شخصیت میں، اِس جسم میں یہ رُوح محبوس ہے، یہ رُوح قید ہے، یہ رُوح گرفتار ہے، مبتلا ہے۔ اِس کی نجات اِس بات میں ہے، اِس کا چھٹکارا اِس امر میں ہے کہ یہ اپنے خداوند کی فرمانبرداری اور اطاعت کرے تا کہ اِس حدیثِ قدسی کے بموجب اِس کو نجات اِس طرح سے ملے اور اتنی بڑی نجات ملے، اتنا بلند رُتبہ اِس کو عطا ہو کہ یہ خدا کے مرتبے پر فائز ہو جائے، خدا کے مرتبے پر فائز ہو جائے اور اِس زندگی کو، اِس سفلی زندگی کو خواب و خیال سمجھے۔ جس طرح ایک انسان خواب کے عالم میں کہیں کسی مصیبت میں گرفتار ہو جاتا ہے، وہ ڈرتا ہے اور اُس پر بہت دکھ اور رنج گزرتا ہے، اتنے میں یکا یک وہ جاگتا ہے، اِس خوف کے زور سے، اِس وحشت سے، اِس ہراس سے وہ جاگتا ہے اور جاگنے کے بعد ایک دم سے اُس کو خوشی کا احساس ہو جاتا ہے۔ وہ شکر کرتا ہے کہ ابھی ابھی خواب کے عالم میں جو اُس نے کیفیت دیکھی تھی خوف کی کیفیت، تکلیف کی، رنج کی، مشقت کی، گرفتاری کی، مرنے کی، بیماری کی، وہ [سب] اُس کا خواب تھا، وہ شکر کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر بیداری میں میرا یہ عالم ہوتا تو پھر مجھ پر کیا گزرتی، کہتا ہے کہ شکر ہے کہ میری مصیبت خواب ہی میں ختم ہو گئی۔

اسی طرح مومن کی انا جب خدا کی وحدانیت میں منتقل ہو جائے گی تو وہی اُس کی حقیقی بہشت ہو گی اور سب سے بڑی بہشت ہو گی۔ سب سے بڑی جنّت [ہو گی]، اِس سے بڑھ کر کوئی جنت نہیں۔ جیسا کہ قرآنِ کریم میں ارشاد ہوا ہے: وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ أَكْبَرُ (۹:۷۲) اور اللہ کی رضامندی تو سب سے بڑھ کر ہے۔ آٹھ جنتیں ہیں لیکن اِن سب سے بڑھ کر اللہ کی خوشنودی ہے، یعنی اللہ کی مرضی پر چھوڑنا کہ وہ جو چاہے مومن کے لئے کرے۔ یہ بات سب سے بڑی ہے، جنّت سے بھی بڑی، اِس کو رضوان کہتے ہیں اور ویسے رضوان ایک فرشتے کا نام ہے جو آٹھ بہشتوں سے اُوپر ہے یا یہ کہ وہ آٹھ بہشتوں کا مالک ہے، اُس کا نام رضوان ہے۔ بہرحال خداوند تعالیٰ کی خوشنودی ہی رضوان ہے اور وہی خوشنودی ہی عظیم فرشتہ ہے۔ تو دُوسروں کے لئے یہ باتیں الگ الگ ہیں، ہمارے نزدیک حکمت میں اور تاویل میں سب باتیں ایک ہیں۔ تاویل

میں، حقیقت میں گنجائش ہے کہ بہت سی حقیقتیں مل جائیں کیونکہ کہا گیا ہے کہ حقیقت ایک لعل کی طرح ہے جس کے کئی کئی پہلو ہیں یعنی ایک تراشا ہوا نگینہ، جو آپ کی انگوٹھی میں ہوتا ہے، اُس کے کئی کئی رُخ ہوتے ہیں، کئی کئی پہلو ہوتے ہیں۔ تو اسی طرح جو اُونچی حقیقتیں ہیں اُن کے بھی کئی کئی پہلو ہیں۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ رضوان فرشتہ ہے، رضوان خداوند کی خوشنودی ہے اور رضوان بہشت سے بڑھ کر ایک درجہ ہے۔ یہ ساری باتیں ایک ہیں، اِن تمام باتوں کا مطلب ایک ہے۔ میں کہہ رہا تھا کہ مومن کی انا، مومن کی خودی، جس وقت خدا کی حقیقت میں منتقل ہو جائے گی تو یہ مومن کے لئے آخری نجات ہے اور یہی چھٹکارا ہے اور یہی حقیقی بہشت ہے۔

اِس کے لئے ہم سب کو دُعا مانگنی چاہئے کہ خداوندِ عالمین ہم کو اِس زندگی میں وہ عالی ہمتی عنایت کرے کہ جس سے ہم جدوجہد کریں اور رُوحانیت کے راستے پر آگے بڑھیں، اپنے ذکر کو کامیاب کریں اور اسی طرح سے عبادت کر سکیں، امامؑ کی خوشنودی کو حاصل کریں اور صحیح معنوں میں اُس کی فرمانبرداری کریں اور ہمیشہ اُس کی خوشنودی کے مطابق کام کریں اور اپنے دینی بھائیوں اور بہنوں کے لئے خیر خواہی کریں، اُن کی بھلائی اور بہتری چاہیں اور ہمیشہ ایسی مجالس سے فائدہ اٹھائیں، علمی فائدہ اٹھائیں، رُوحانی فائدہ اٹھائیں، عقلی فائدہ اٹھائیں اور ہم خداوند کی معرفت میں آگے بڑھیں اور اعلیٰ حقیقتوں کو سمجھ سکیں اور اس حقیقت کو سمجھ سکیں کہ کس طرح ہم اپنی انا کو خدا کی حقیقت میں منتقل کر سکتے ہیں، اسی کے لئے سب کی دُعا ہونی چاہئے اور ساتھ ہی ساتھ آپ دعا مانگیں مولا کے حضور سے کہ اِس نیک گھر کے افراد نے جس طرح سے اہتمام کیا ہے اور جیسے انتظام کیا ہے اِس مجلس کے لئے اور انہوں نے زحمت [اُٹھائی ہے] اور [اِن کی جو] حاجتیں ہیں وہ پوری ہو جائیں، اُن کے سب گناہوں کو مولا بخش دے، اُن کو صراطِ مستقیم پر ثابت قدم رکھے، اُن کے علم میں اضافہ کرے، اُن کے ایمان کی روشنی میں اضافہ کرے، اُن کے یقین میں اضافہ کرے، اُن کو اور زیادہ عالی ہمتی اور بلند حوصلہ عطا کرے۔ تاکہ وہ جماعت کی اور امامؑ کی خدمت کر سکیں اور علم کی خدمت کر سکیں اور معرفت کی خدمت کر سکیں اور زندگی میں اِس مقدس مذہب کے اندر جو گوہر ہیں اُن کو چُن سکیں اور دین کے معجزات کو دیکھ سکیں اور پھر اُن کو قیامت میں کوئی افسوس نہ رہے، ان کو دونوں جہان میں خداوند کامیابی عطا کرے، سرخروئی اور سربلندی عطا کرے اور اِن کو دیدارِ ظاہر اور دیدارِ باطن کی نعمت سے نوازے اور معرفت کی لازوال سلطنت اِن سب کو عطا ہو۔ آمین! یاربّ العالمین! صلوات پڑھیں۔

ٹائپنگ: اکبر علی پروف: نسرین اکبر

استادِ بزرگوار علاّمہ نصیر الدّین نصیرؔ ہونزائی (ق س) کا پُرحکمت بیان

عنوان: انسانی اختیار

کیسٹ نمبر: ۱۰ تاریخ: ۱۹۷۷ء، کراچی

Click here for Audio

عزیزانِ من! میں کہنا چاہتا تھا کہ اُمّت کے اندر پیغمبر کو جو رُتبہ حاصل ہے وہی رُتبہ انفرادی عقل کو اس شخصیت کے اندر حاصل ہے یا اس مطلب کو ان الفاظ میں ادا کرنا چاہیئے کہ ہماری جو عقل ہے وہ ہمارے اندر پیغمبر کی جگہ پر ہے۔ کیونکہ قانونِ الٰہی کے لئے یہ ضروری تھا کہ اگر ایک اُمّت کے لئے ایک پیغمبر کی ضرورت ہوتی ہے اور وہاں پر ایک پیغمبر کو بھیج دیا جاتا ہے تو شخصی وجود یعنی انسان کی ہستی میں بھی، پیغمبر کی مثال پر کوئی چیز ہوتا کہ وہ ایک طرف سے عالمِ دین کے اندر جو سب سے اہم چیز ہے یعنی پیغمبر، اُس کی مثال بنے اور دوسری طرف سے ہر شخص کو خدا کی طرف سے کوئی گلہ باقی نہ رہے کہ اس نے انسان کے اندر ایسی کوئی طاقت کیوں نہیں رکھی جو [اُسے] ہمیشہ نیکی پر اُبھارنے والی ہو، چنانچہ خداوندِ عالم نے اس کے لئے انسان کے اندر عقل رکھی اور انسان میں عقل ہی ہے جو انسان کو صحیح معنوں میں انسان بنا سکتی ہے، معاملہ دین کا ہو یا دُنیا کا عقل کے بغیر درست نہیں ہوسکتا۔

اب اگر عقل کی کوئی مخالف طاقت نہ ہوتی تو انسان سے کوئی آزمائش نہ لی جاتی اور اگر آزمائش اور امتحان نہ ہوتا تو فضیلت اور شرافت کے مختلف درجات مقرر نہ ہوتے۔ اس لئے قانونِ الٰہی کے بموجب یہ بھی ضروری ہوا کہ عقل کے ساتھ ساتھ نفس کے نام سے ایک شرّ کی طاقت انسان میں مقرر کر دی جائے، اور ان دو چیزوں کی وجہ سے اختیار کی صلاحیت پیدا ہوگئی، یعنی عقل کی خواہش اور نفس کی خواہش میں سے انسان کس کی پیروی کرتا ہے، اُس کا نام اختیار ہے۔ اختیار کے متعلق اس سے کوئی بہتر مثال نہیں ہے کہ ہم عقل کی فرمائش اور نفس کی فرمائش دونوں کو برابر برابر سمجھیں اور ان دو خواہشوں میں سے انسان کو کسی ایک کے پسند کرنے پر قادر سمجھیں، اختیار کے فلسفہ کو سمجھنے کا یہی بہترین طریقہ ہے۔

اگر یہ بات نہ ہوتی، عقل کی کشش زیادہ اور نفس کی کشش کم ہوتی تو اس صورت میں اختیار صحیح معنوں میں اختیار نہ رہتا، وہ تو نیکی کی طرف مائل ہوجانے کی ایک مجبوری ہوتی۔ یہ باتیں اِس حقیقت کے ثبوت میں ہیں کہ انسان کے اندر جو عقل

ہے، اُس کی وجہ سے انسان پر بہت سے فرائض عائد ہوجاتے ہیں اور خدا کی طرف سے جواب طلبی لازم ہوجاتی ہے یعنی انسان کو عقل کی صلاحیت اور اختیار دینے کے باوجود اُس نے کیوں راہِ شیطان کی پیروی کی۔

کچھ نظریات ایسے ہیں کہ ان کے نہ سمجھنے سے انسان علمی اور رُوحانی طور پر بڑے خسارے میں رہتا ہے۔ اِس لئے اسماعیلیت کا یہ تقاضا ہے کہ ہم زیادہ سے زیادہ بنیادی حقائق کی طرف توجہ دیں اور اُن کو اچھی طرح سے سمجھیں تاکہ ہم دوسروں کی طرح خسارے میں نہ رہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ حکیم کے اندر سورۃ عصر [۱۰۳:۲] میں قسم کھا کر ذکر کیا ہے کہ انسان خسارے میں ہے۔ اور خسارہ اُسے کہتے ہیں جس میں کہ تجارت اور سودے سے کوئی فائدہ نہ ہو بلکہ اصل سرمائے کا بھی نقصان ہو۔ اس سے ظاہر ہے کہ دُنیا کے اندر بہت سارے انسان ایسے ہیں جن کے دُنیا میں آنے سے فائدہ نہیں بلکہ نقصان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم کوشش کرتے ہیں کہ عقل کی حقیقت کو سمجھیں، اختیار کو سمجھیں تاکہ جس سے ہمیں اپنے فرائض کا اچھی طرح سے احساس ہو۔ چنانچہ جو لوگ عقل اور اختیار کے فلسفے کو نہیں جانتے ہیں وہ یہ مانتے ہیں کہ انسان ہر طرح سے مجبور ہے، اور وہ اس ضمن میں یہ بھی مانتے ہیں کہ جو قسمت میں لکھا ہے وہی ہوتا ہے۔ حالانکہ یہ عقیدہ اتنا کمزور ہے اور یہ تصوّر اِس قدر بے بنیاد ہے کہ جس کو ذرا بھی شعور ہو، وہ سمجھتا ہے کہ یہ نظریہ غلط ہے۔ وہ اِس طرح کہ اگر مانا جائے کہ انسان کی قسمت میں جو لکھا ہے وہی پاتا ہے تو پھر اس تصوّر کے نتیجے میں جنّت بھی نہیں ہونی چاہئے اور دوزخ بھی نہیں ہونی چاہئے، اور حساب، کتاب، قواعد کچھ بھی نہیں ہونا چاہئے اور اگر ہے تو پھر فضیلت اور جزا و سزا کا تصوّر باطل ہوگیا۔ کیونکہ خدا نے جن کو چاہا بہشت میں داخل کیا اور ان کے لئے اچھی قسمت لکھی اور جن کو چاہا اُس نے جہنم میں ڈال دیا اور ان کے لئے بُری قسمت لکھی، یہ تو زبردستی ہوگئی، نیکی کے لئے بھی اور بدی کے لئے بھی، اس میں کسی کا کوئی اختیار نہیں رہا اور اختیار کا تصوّر باطل ہوگیا اور پھر اِدھر سے حکم دینا کہ یہ کرو اور وہ نہ کرو، یہ بھی غلط ہوگیا۔ اس مثال سے ظاہر ہے کہ خداوندِ عالم نے کسی حد تک انسان کو اختیار دیا ہے اور اختیار کے دینے کے نتیجے میں انسان پر خصوصاً مومن پر بڑے بڑے فرائض عائد ہوجاتے ہیں۔ اِس حقیقت کے سمجھنے سے مومن کا فائدہ یہ ہے کہ ایک تو وہ خسارے میں نہیں رہتا ہے اور دوسرا اپنی کوششوں سے اور فرائض کے سمجھنے سے وہ کارہائے نمایاں انجام دے سکتا ہے۔

ہمارے اماموں نے اور پیروں نے جیسی تعلیمات ہم کو دی ہیں ان کی روشنی میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مومن اپنے لئے بہت کچھ کرسکتا ہے، بہت کچھ کرسکتا ہے، بہت ترقی کرسکتا ہے۔ علم میں، رُوحانیت میں، معرفت میں بہت ہی آگے بڑھ سکتا ہے اس کے لئے کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ اگر رکاوٹ ہے تو انسان کی اپنی جہالت کی وجہ سے ہے، غفلت کے سبب

سے ہے، لاعلمی کی وجہ سے ہے۔ دیکھا آپ نے کہ علم [میں] کیسی روشنی ہے اور علم سے کس قدر رُوحانی ترقی ممکن نظر آتی ہے اور ہر قسم کی غلط فہمی دُور ہو جاتی ہے، شکوک وشبہات کا ازالہ ہو جاتا ہے، اخلاقی اصلاح بھی علم کی بدولت ہوتی ہے، علم ہی ہمیں حوصلہ بخشتا ہے کہ ہم کوشش کریں، آگے بڑھیں، علم ہی کی روشنی میں ہم کو راہِ مولا پر چلنا اور ترقی کرنا ممکن نظر آتا ہے۔ علم ایک نور ہے، یہ خدا کا نور ہے، اِس نور کی، اِس روشنی کی بڑی اہمیت ہے۔ رُوحانیت میں، دین میں اور ہر مقام پر۔ علم سے بڑھ کر کوئی طاقت نہیں ہے۔ دُنیا کی مثال میں بھی آپ دیکھتے ہیں، آج اُسی قوم کی زیادہ سے زیادہ ترقی ہے جس کے وہاں علم کی بہت بڑی قدر ہے اور [آج] سائنس میں، علم میں، ہنر میں جو قوم آگے ہے وہ دنیوی اور مادّی طور پر بھی آگے ہے ، تو رُوحانی علم کی بھی یہی مثال ہے۔ دینی علم، رُوحانی علم کی بہت ہی ضرورت ہے۔ یہ تزکیۂ نفس، یہ ریاضت، یہ گریہ و زاری، یہ مناجات بھی اِس لئے ہے کہ ہم خود کو اُس علم کے لئے تیار کریں جو براہِ راست خداوند سے ملتا ہے، اس کو علمِ لدّنی کہا جاتا ہے۔ چنانچہ اگر لوگ ہماری گریہ وزاری پر اعتراض کرتے ہیں تو اُس سے ہمیں دلگیر نہیں ہونا چاہئے، اُس سے ہم کو شرم نہیں آنی چاہئے۔ دیکھئے ! ہم ایک بہت بڑے کام کے لئے تیاری کر رہے ہیں۔ جو لوگ اِن مشقوں سے متعلق اعتراض کرتے ہیں وہ ناسمجھ ہیں، وہ نہیں جانتے ہیں اس فن کو، اس ہنر کو، یہ ایک ہنر ہے، یہ ایک مشق ہے، یہ ایک سائنس ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایک سائنس ہے، یہ ایک ریسرچ ہے، یہ تحقیق ہے، یہ کوشش ہے۔ بچے کو آپ نے دیکھا ہے کہ ایک چھوٹا سا بچہ جسے پیدا ہوئے تھوڑا سا وقت گزر گیا ہے تو وہ کس طرح ہاتھ پاؤں کو ہلاتا ہے، ایک ناسمجھ انسان دیکھے تو ممکن ہے کہ اس کو مذاق سمجھے یا اس کو نادانی سمجھے، ناسمجھی سمجھے لیکن یہ قدرت کی طرف سے ناسمجھی نہیں ہے، یہ ایک بندوبست ہے، یہ ایک مشق ہے، یہ ایک کوشش ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ ایک تو وہ اسی غیر منظم حرکت سے آگے چل کر چلنا سیکھے، پکڑنا سیکھے اور حرکت سیکھے اور ساتھ ہی ساتھ وہ اس کی ورزش [بھی] ہے جس سے کہ اس کی رگیں، پٹھّے مضبوط ہو جاتے ہیں۔ یہ کوشش فضول نہیں اور وہ زبان آنے سے پہلے ایک مہمل سی آواز نکالتا ہے، آں آں کرتا ہے، بابا کرتا ہے۔ کیا کسی کو اُس پر مذاق اڑانا چاہئے؟ یا اُس سے کوئی چیز بننے والی ہے [کیونکہ] آگے چل کر اِسی سے زبان پیدا ہوتی ہے۔ تو اسی طرح اب ہم گریہ وزاری کے دوران رُوحانیت کی بچگانہ حرکتیں کرتے ہیں، تو یہ بچگانہ حرکتیں آگے چل کر رُوحانیت کی صحیح صورت اختیار کر سکتی ہیں۔ اسی میں سے رُوحانیت پیدا ہو سکتی ہے۔ ذکر کے دوران ہم کہتے ہیں کہ دیکھو، تصوّر کرو فلاں چیز ہے یا گلاب کا ایک پھول ہے اور بعض دفعہ ہم کہتے ہیں کہ دیکھو! دیدار کا تصوّر کرو، پھر کہتے ہیں کہ دیکھو! امامؑ کا تصوّر کرو کہ وہ کرسی پر ہیں، بعض دفعہ ہم کہتے ہیں کہ دیکھو! تم ہی لوگ ہو، امامؑ کے دربار میں بیٹھے ہو وغیرہ۔ یہ مشقیں ہیں، یہ جھوٹ نہیں ہے، یہ

تصوّر دینا ہے، تو بعض جدید علوم بھی اسی طرح ہیں کہ ان کے اندر مشقیں ہوتی ہیں۔ ایک سپاہی کو آپ نے دیکھا ہے، وہ لیٹ جاتا ہے، بالکل وہی حرکتیں کرتا ہے جو جنگ میں اختیار کی جاتی ہیں، کیا اُس وقت کوئی جنگ ہے؟ نہیں، یہ جنگ کے لئے مشق کر رہا ہے۔ تو اسی طرح ہماری یہ مشق بھی جھوٹ نہیں ہے، جب ہم کہتے ہیں کہ دیکھو شاہ کریم تمہارے درمیان تشریف فرما ہیں، ہوسکتا ہے بتانے والا ایسی کوئی شکل وصورت دیکھتا ہو، نہیں تو تصوّر تو ہے، ہمارے تصوّر میں ہر چیز کی خفیف خفیف شکل آسکتی ہے، ہم جس کو بھی ذہن میں لائیں، خاطر میں لائیں اس کی خفیف خفیف سی صورت، اُس کی ایک جھلک موجود ہوتی ہے۔ یہ بات کیسے جھوٹ ہوسکتی ہے، انسان کو تجربہ ہے کہ وہ جب چاہے اپنے مشاہدات میں سے کوئی چیز تصوّر میں لاسکتا ہے، اور اسی دوران وہ چیز اس کے تصوّر میں موجود ہوتی ہے۔ مثلاً ابھی ابھی آپ کسی باغ کا تصوّر کریں، جیسے ہی میرے منہ سے باغ کا لفظ نکل گیا تو آپ کا تصوّر باغ کی طرف گیا، اور آپ کے ذہن کی سطح پر کوئی نہ کوئی باغ نظر آیا، کوئی نہ کوئی باغ اُبھر آیا۔ جب میں کہوں کہ مولا کا تصوّر کرو تو ایک دم سے آپ سب کا خیال مولا کی طرف گیا اور ہر ایک میں کسی نہ کسی روپ میں مولا کے تصوّر کی ایک جھلک نظر آنے لگی، یہ تصوّر ایک حقیقت ہے اور تصوّرِ رُوحانیت کی مشق ہے۔ جس طرح بعض لوگ بلور بینی کی مشقیں کرتے ہیں، بعض لوگ شمع بینی کرتے ہیں۔

اسی طرح شمع بینی ہے، تو شمع بینی اور بلور بینی میں یہ فرق ہے کہ شمع کی روشنی باطن میں داخل ہوجاتی ہے۔ لوگوں نے اس کا تجزیہ نہیں کیا، انہوں نے نہیں سمجھا کہ شمع بینی کے نتیجے میں باطن کے اندر روشنی کیوں نظر آتی ہے؟ میری نگاہ میں، میری نظر میں کوئی ایسی کتاب نہیں ہے جس کے اندر اس کا تجزیہ کیا گیا ہو، اور وجہ بتائی [گئی] ہو کہ شمع بینی کے نتیجے میں دل کے اندر روشنی کیوں پیدا ہوتی ہے، کسی نے [تجزیہ] نہیں کیا۔ تو میں نے ان چیزوں میں سے دو Items کو یہاں لیا ہے اور بلور بینی کے بارے میں، میں نے یہ بتایا کہ بلور بینی میں سنگِ بلور کی سطح پر کوئی چیز نہیں ہے۔ لہٰذا ظاہری آنکھ اور باطنی آنکھ کے درمیان جو پردہ ہے اس کے ہٹ جانے کے نتیجے میں تصوّر میں جو چیز ہوگی وہی سنگِ بلور کی سطح پر نظر آئے گی، اور شمع بینی میں یہ فرق ہے کہ شمع ایک روشن چیز ہے، اس کے نتیجے میں ظاہر کی چیز باطن کی طرف منتقل ہوجاتی ہے۔ تو ظاہری روشنی دل کے اندر منتقل ہوجاتی ہے، تو یہ ارواح کا نور نہیں ہے۔ شمع بینی کے نتیجے میں جو لوگ اپنے باطن کے اندر روشنی دیکھتے ہیں وہ خدائی نور نہیں ہے، وہ مادی روشنی ہے۔ اس جیسی روشنی شمع بینی کی مشقوں کے بغیر بھی رُوحانیت کے ابتدائی مراحل میں سامنے آتی ہے۔ وہ بھی اس ظاہری دُنیا کی روشنی کا ایک عکس ہے کہ جب ظاہر اور باطن کے درمیان کا جو پردہ ہے، ہٹ جاتا ہے تو اس وقت ہم باطن کی چیزوں کو ظاہر میں دیکھتے ہیں اور ظاہر کی چیزوں کو باطن میں دیکھتے ہیں۔

یہاں یہ ایک بات مجھے یاد آئی وہ یہ کہ آپ نے قرآن کا ایک قصہ، جو قصۂ ذوالقرنین ہے[وہ]سنا ہوگا [(۱۸:۹۱۔۹۸)]،اِس قصے میں بیان کیا جاتا ہے کہ کچھ لوگوں نے شکایت کی یا درخواست کی ذوالقرنین سے کہ ان کے قریب میں کوئی انجان سی، ناسمجھ سی قوم رہتی ہے، وہ قوم اُن پر حملہ آور ہو کر فساد مچاتی ہے اور اُن کا نقصان کرتی ہے، تو اس کے لئے انہوں نے درخواست کی کہ اس مفسد قوم اور ان لوگوں کے درمیان کوئی موٹی اونچی دیوار کھڑی کر دی جائے۔ چنانچہ اُن کی [اس] درخواست کے نتیجے میں سکندر نے ایک موٹی اور اونچی دیوار کھڑی کر دی۔لوگ اِس کو ظاہری پہلو سے مانتے ہیں ،ہمارے یہاں اس کی تاویل ہے۔وہ سکندر یا کہ ذوالقرنین اُس زمانے کا امام تھا اور ہر زمانے کا امام ذوالقرنین ہے۔تو اب عام حالت میں ایک عام انسان اور رُوحانیت کے درمیان جو پردہ ہے وہ سدِ سکندری[کہلاتا] ہے اور ذوالقرنین کی دیوار ہے[جو] ہونی چاہئے، تاکہ بغیر تیاری کے رُوحیں ہم پر حملہ آور نہ ہو جائیں۔رُوحیں جو یاجوج اور ماجوج کے نام سے ہیں وہ ہم پر بغیر تیاری کے حملہ آور نہ ہو جائیں۔ہم سُدھرے نہیں ہیں، ہم رُوحانیت کے لئے تیار نہیں ہیں ،ہمارے اعمال اچھے نہیں ہیں اور ہمارے دل کی آنکھ کھلی نہیں ہے، ہمارے تصوّرات اچھے نہیں ہیں، ہمارے خیالات و افکار اچھے نہیں ہیں تو اس صورت میں رُوحانیت ہم پر حملہ آور ہوگئی تو ہمارا بُرا حشر ہوگا۔سب بُری چیزیں، سب خوفناک، سب ہیبت ناک[چیزوں سے] ہم ڈر جائیں گے اور ہمارے سامنے کوئی اچھی چیز نظر نہیں آئے گی۔لہٰذا یہ ذوالقرنین کی مہربانی ہے کہ اُس نے ہمارے اور یاجوج و ماجوج کے درمیان ایک موٹی اونچی دیوار کھڑی کر دی ہے اور جب قیامت قریب آئے گی یعنی جب ہماری ریاضت درجۂ کمال کو پہنچے گی تو اس وقت وہ دیوار نہیں ہونی چاہئے، اس وقت اُن یاجوج و ماجوج کو چاہئے کہ وہ اس دیوار کو، موٹی دیوار کو چاٹیں یا اُس کو پھلانگیں اور ہم سے قریب آئیں، اور جا کر رُوحانیت کا مشاہدہ کریں اور رُوحانیت کا تجربہ کریں، اور ہر چیز کو حسن و خوبی سے دیکھیں۔تو یہ بات اس لئے درمیان میں آئی کہ حواسِ ظاہر اور حواسِ باطن کے درمیان ایک پردہ ہے، اس پردے کو ہم[اچھے] اعمال، ریاضت، عبادت، ذکر سے ہٹا سکتے ہیں، پھر اُس وقت ہماری دُنیا اور آخرت ایک ہو جائے گی۔پیر ناصر خسرو قس نے ایک اچھا شعر اس مقام پر کہا ہے وہ یہ کہ:

زدُنیا تا بعقبیٰ نیست بسیار ولی در رہ وجودِ تُست دیوار

دُنیا سے لے کر آخرت تک کچھ بھی مسافت نہیں ہے اور اگر دُنیا سے آخرت الگ ہے تو اس کی وجہ تیری اپنی ہستی ہے جو کہ دُنیا اور آخرت کے درمیان حائل ہوگئی ہے ایک دیوار کی طرح اور اگر اُس دیوار کو تم ہٹاؤ گے، تو پھر تیری دُنیا اور تیری آخرت ایک ہو جائے گی۔تو یہ سدِّ سکندری ہے، یہ پردہ ہے جو ظاہر اور باطن کے درمیان ہے۔جب ہم عبادت اور

ریاضت سے اس کی تحلیل کریں گے تو اُس وقت ہماری رُوحانیت اور جسمانیت ایک ہو جائے گی۔

میں دراصل اُس ذمہ داری کے بارے میں بات کرتا تھا کہ انسان میں جو عقل ہے وہ خدا تعالیٰ کی طرف سے بہت بڑی حجّت ہے، بہت بڑی ذمہ داری ہے اور اسی عقل کی وجہ سے مومن پر بڑے بڑے فرائض عائد ہو جاتے ہیں اور اگر عقلی طور پر حیوان پر کوئی فرض نہیں ہے تو اُس کی وجہ صرف یہی ہے کہ اُس میں عقل نہیں ہے اور عقل کے نہ ہونے سے حیوان کو کوئی فضیلت نہیں ہے، کوئی شرافت نہیں ہے، وہ تو عذاب میں ہے، جو انسانوں کے ہاتھ سے عذاب اُٹھاتا ہے۔ وہ گویا عقل کے نہ ہونے سے جہنم میں ہے جسمانی، رُوحانی اور عقلی، تین قسم کے جہنم ہیں۔ اور حیوان کے علاوہ دُنیا کے اندر جن لوگوں کو عقل نہیں ہے وہ جہنم میں ہیں۔ لیکن عقل، کون سی عقل؟ وہ عقل جو مادّی کام کرتی ہے یا وہ عقل جو دین کا کام زیادہ جانتی ہے، وہ عقل جس کو صرف دنیوی علم حاصل ہے یا وہ عقل جس کو دینی اور رُوحانی علم [حاصل ہے]۔ اگر آپ کو دونوں عقلیں دی جائیں تو زہے قسمت، اور اگر آپ کو ایک دی جائے تو کس کو منتخب کریں گے؟ دنیوی عقل یا دینی عقل، کوئی بات نہیں اگر آپ کو دی جائیں تو دونوں لینی چاہئے۔ اگر دونوں نہیں دی جاتی ہیں، ایک ہی دی جاتی ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ آپ ہمیشہ دینی عقل کو پسند کریں گے، اُسی کو منتخب کریں گے۔ کیونکہ دُنیا دو دن کی ہے، یہ کسی طرح سے بھی چلتی ہے اور کسی طرح سے بھی ہم اِس زندگی کو گزار سکتے ہیں اور گزارہ ہو سکتا ہے۔ لیکن دینی عقل نہ ہو، دینی علم نہ ہو تو پھر اس لاانتہا زندگی کے لئے ہم کیا کریں گے بصورت یہ کہ دینی علم و دینی عقل نہ ہو۔ اس لئے اگر آپ کو دین کا شعور دیا گیا ہے تو خداوندِ عالم نے بنیادی طور پر آپ کو بہت بڑی نعمت سے نوازا ہے۔ اب آپ کے ہاتھ میں ہے اور آپ کے اختیار میں ہے بھلائی، بہتری، فضیلت، شرافت، علم، رُوحانیت سب آپ کے ہاتھ میں ہے، نہ کہیں کہ [یہ] مولا کے ہاتھ میں ہے۔ کلید، چابی دی گئی ہے، کوٹھی کے تالے کو آپ چابی سے کھولیں اور اُس کے اندر خزانہ ہے، سب کچھ ہے۔ آپ پھر کس چیز کے انتظار میں ہیں؟ چابی جو دی گئی، تو اجازت دی گئی کہ آپ کوٹھی میں داخل ہو جائیں، بنگلے میں داخل ہو جائیں، جس کے اندر سب کچھ ہے، محل میں داخل ہو جائیں۔ تو یہ چابی عقل ہے اور صرف عقل نہیں ہے، اِس کے ساتھ نورانی ہدایت بھی ہے، ظاہر میں بھی اور باطن میں بھی۔ کامیابی کے جتنے وسائل ہیں وہ سب آپ کو فراہم کئے گئے ہیں، کوئی وسیلہ ایسا نہیں ہے جو آپ سے فروگزاشت کیا گیا ہو۔ [ایسا نہیں کہ] آپ کو اِس کے دینے میں دریغ کیا ہو، دریغ نہیں کیا، بے دریغ سب نعمت آپ کے سپرد کر دی گئی ہے۔ آپ کو بہت کچھ نوازا گیا ہے اور سب کچھ دیا گیا ہے۔ صرف اب [یہ] ہے کہ اُس کو استعمال کریں، اُس سے فائدہ اٹھائیں۔

ایک چیز، آپ کو ایسا گمان نہ ہو کہ ہمارے مذہب کے اندر [جو] مولا سے رُجوع کرنے اور دُعا مانگنے کا طریقہ ہے، اُس سے کسی کو غلط فہمی ہو سکتی ہے، اُس سے یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ اب ہمارے ہاتھ میں کچھ نہیں ہے۔ [نہیں] ہمارے ہاتھ میں بہت کچھ ہے، یہ دُعا ایک قوت ہے، یہ دُعا ایک صلاحیت ہے، اپنے آپ میں عجز و انکساری کی قوت پیدا کرنے کے لئے اور ادب کو بجالانے کے لئے۔ یہ ادب ہے کہ ہم یہ کہتے ہیں کہ مولا! تو ہی کرنے والا ہے، ایک لحاظ سے صحیح ہے اور دُوسرے لحاظ سے صحیح نہیں ہے۔ مولا نے جو دین کا راستہ بتایا ہے تو سب کچھ دے دیا ہے، پھر بھی اگر ہم کہتے ہیں کہ مولا! تو ہی ہے، یہ ہمارا ادب ہے نہ کہ حقیقت، حقیقت نہیں ہے، ادب ہے، ادب کرنا چاہئے اور کہنا چاہئے اور دعا کرنی چاہئے، اور مانگنی چاہئے، وہ قوت ہے، وہ صلاحیت ہے۔ جس طرح بادشاہ کا کوئی ماتحت کوئی اچھا کام اپنی طاقت سے کر کے پھر اُس اچھے کام کو بادشاہ سے منسوب کرتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ تو آپ کے بخت سے ہے، آپ کی حکمت سے ہے، یہ تو آپ کی بدولت ہے، ایسا ہونا چاہئے کیونکہ وسیلہ اُسی نے مہیا کیا ہے، یہ جو عقل دی ہے اُسی نے دی ہے، پھر اُس کی دی ہوئی عقل سے جو ہم کام کریں گے۔ اِس میں سمجھنے کی ضرورت ہے یعنی ایسا نہ ہو کہ ہم اس صلاحیت سے انکار کر بیٹھیں جو اس نے ہم [کو] عطا کر رکھی ہے۔ ہمارے اندر بہت صلاحتیں ہیں، بہت قوتیں ہیں، ہم اُن سے کام لے سکتے ہیں۔ تاہم شرطِ ادب یہ ہے کہ اچھے کاموں کو مولا سے منسوب کریں۔ قرآن میں بھی ایک جگہ پر ہے جو کچھ اچھا ہے وہ خدا کی طرف سے ہے اور جو کچھ بُرا ہے تو وہ تمہارے نفس کی طرف سے ہے، یہ تو ادب سکھلانے کے لئے ہے۔ ایسے کیسے دُرست ہو سکتا ہے کہ اچھی چیز خدا کے حضور سے ہو اور بُری چیز شیطان سے ہو، تو پھر شیطان بھی خدا کے برابر کا ایک وُجود بن گیا، یہ بات نہیں ہے، یہ ادب سکھلانے کے لئے ہے اور طریقِ ادب پر چلانے کے لئے ہے۔

ہر چیز کا وسیلہ خدا مہیّا کر دیتا ہے لیکن فعل جو کرتا ہے وہ انسان خود کرتا ہے، نیکی کا بھی اور بدی کا بھی، وہ چاہے تو شیطان سے رُجوع کر سکتا ہے، وہ چاہے تو ہادیٔ برحق یعنی امامؑ سے اور رہنما سے رُجوع کر سکتا ہے ۔ بہرحال امام کو یہ پسند ہے کہ ہم اپنی صلاحیتوں کو سمجھیں، جو کچھ اُس نے ہمیں عنایت کیا ہے اُس کی قدردانی کریں اور شکر کی ایک صورت یہ ہے کہ ہم خدا کی دی ہوئی نعمت کو صحیح معنوں میں سمجھیں، شکر کچھ زبانی لفظوں میں محدود نہیں ہے کہ ہم زبانی زبانی کہیں کہ شکر ہے، شکر ہے، شکر ہے، تو یہ شکر ہو جائے گا ٹھیک ہے، یہ بھی شکر کی ایک صورت ہے اور ایک پہلو سے شکر ہے، تمام پہلوؤں سے شکر نہیں ہے یہ، شکر کے بہت سے پہلو ہیں وہ یہ کہ خدا کی نعمتوں کی حقیقت کو سمجھیں، اختیار کی دولت کو سمجھیں اور اپنی قوتوں کو سمجھیں، اپنی صلاحیتوں کو سمجھیں کہ اُس نے ہمارے اندر کیسی کیسی صلاحیتیں دے رکھی ہیں۔ اگر ہم اُن صلاحیتوں کو بُنیاد سے سمجھتے ہیں اور کما

کان حقہٗ سمجھتے ہیں تو ہم خدا کی نعمت کا عملی طور پر شکر بجالاتے ہیں۔ مومن کو عالی ہمت ہونا چاہئے، مومن کو یہ نہیں سوچنا چاہئے کہ میرا یہ کام خدا کرے گا اور نا کامی ہو تو خدا پر الزام رکھیں، کہیں کہ خدا نے میری قسمت میں یہ نہیں رکھا تھا اور اگر کامیابی ہو تو کہیں کہ یہ سب مولا نے کیا، ٹھیک ہے کہ مولا نے کیا لیکن یہ بھی سمجھیں کہ اس میں کوئی وجہ ہے، کوئی کام کیا گیا ہے، مگر لاعلم نہیں ہونا چاہئے اگر لاعلمی سے کہیں اور محض رسمی طور پر کہیں کہ یہ مولا نے کیا تو اِس میں ہمارا نقصان ہوگا۔ بے شک ہم اُس نیکی کو مولا سے منسوب کریں اور ضرور کریں لیکن اِس معنی میں کریں کہ جو وسیلہ اُس نے دیا تھا، اِس معنی میں یہ کام اُس نے کیا اور وسیلے سے جو کام لیا وہ ہم نے لیا۔ کیا ہم اُس کی چیز کو گھٹا کر اُس کو خوش کر سکتے ہیں؟ اُس کی قدرت سے انکار کر کے جو ہمارے اندر ہے، [اور کیا] اُس کے وسیلے کو ٹھکرا سکتے ہیں، یہ بات اُس کو اچھی لگے گی؟ نہیں یہ اُس کی تعریف ہے کہ ہم اُس کے وسائل کو سمجھیں، اس کی قوتوں کو سمجھیں، اُس کی صلاحیتوں کی قدر کریں۔ تو محض اندھا پنے سے ہمیں نہیں کہنا چاہئے کہ مولا نے کیا، مولا نے کیا، مولا نے کیا، کس طرح سے کیا؟ تفصیل سے سمجھیں نا! کہ یہ مولا نے کیا، کہ اُس نے ایک صلاحیت دی اور صلاحیت دینا بہت بڑا کام ہے۔

دُنیا کے اندر آپ کسی کو ایک مشین دیتے ہیں، یہ آپ کی کوئی بڑی مہربانی نہیں ہے، آپ مشین بنانا سکھائیں، کسی کو جہاز دیا جاتا ہے اور کسی کو جہاز بنانا سکھایا جاتا ہے، کس پر زیادہ مہربانی ہوئی؟ اُس پر جس کو جہاز بنانے کا طریقہ سکھایا گیا، جہاز بنانے کی Technique بتائی گئی، فن بتایا گیا۔ تو خداوند نہ صرف کوئی چیز دیتا ہے، بلکہ چیز پیدا کرنے اور بنانے کی قوت عطا کرتا ہے۔ ہم ایسے خدا کے قائل ہیں۔ یہ اس کی زیادہ تعریف ہے کہ ہم زیادہ سے زیادہ اُس کی قوتوں کو صلاحیتوں کو سمجھیں، یہ اُس کی عملی تعریف ہوگی۔ ہم کو خدا سے دعا مانگنی ہے کہ خداوندا! ہم کو بیدار کرنا صبح کے وقت تا کہ ہم خوب عبادت کریں، ہم کیوں یہ دعا نہ مانگیں کہ خداوندا! ہم کو وہ صلاحیت دے کہ جس سے ہم اپنی ذمہ داری کا احساس کریں۔ ہمیں چھوٹی چیز کیوں لینی چاہئے؟ حالانکہ امام کا ارشاد ہے کہ مومن کی نگاہ بہت دُور، بلندی کی طرف جانی چاہئے۔ اِس کے کیا معنی ہیں؟ آپ نے کبھی سوچا ہے کہ ہم اِس کی تعمیل کے طور پر آسمان کی طرف دیکھیں، اُوپر دیکھیں، یہ نہیں ہے یعنی ہم سمجھیں کہ ہمارے اندر کیا ہے اور ہم اپنے اُونچے سے اُونچے مرتبے کو سمجھیں، اُس کی شناخت حاصل کریں، یہ سب کچھ علم کی تعریف ہے اور آپ کو اِس مجلس میں، مجلس کے اِس حصّے میں علم کی اہمیت بتائی جا رہی ہے، علم کی طرف آپ کو توجہ دلائی جا رہی ہے اور اِس کی مثال بتائی جا رہی ہے اور یہ بتایا جا رہا ہے کہ مومن کب خسارے میں ہوتا ہے اور کب فائدے میں ہوتا ہے۔ حقیقی علم، بنیادی علم، علم الیقین [ہے] اور جس کے نتیجے میں روشنی حاصل ہوتی ہے، جس کے نتیجے میں خدا کی نعمتوں کی

شناخت ہوتی ہے۔آپ مانیں گے کہ علم کی قسمیں ہیں، کچھ علوم برائے نام ہیں، صرف اُن کا نام علم ہے، وہ علم نہیں ہے، وہ جہالت ہے۔دُنیا والوں کی لاکھوں کی کتابوں کو آپ نچوڑیں، اُس میں سے عطر کی ایک بوند پیدا نہیں ہوگی۔آپ ۱۰۰ ٹن بھوسی کو پیسیں آٹا بنے گا، [پھولوں کو] نچوڑیں عطر بنے گا، اُس میں خوشبو ہے۔زیادہ کس کی اہمیت ہے؟ اُس میں رُوح ہے، عقل ہے، چیز ہے تو چیز پیدا ہوگی نہیں تو اُس کی ضخامت اور جسامت کی کیا قدر اور اُس کی کیا اہمیت؟ اگر ایک پھول ہے تو اس میں عطر ہے، اگر گھاس پھوس ہے تو اس میں عطر نہیں ہے، تو اصل چیز اگر تھوڑی ہے تو وہ کافی ہے اور جعلی چیز بہت زیادہ ہے تو اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔عطر کا ایک قطرہ یہاں رکھیں، چھڑکائیں تو ساری محفل خوشبو سے مہک اٹھے گی۔ایک قطرے کی کیا بات ہے، ایک قطرہ ہونے کے باوجود اتنے بڑے کمرے میں تمام افراد کے لئے وہ خوشی مہیّا کرے گا۔ایک اگربتی کو جلائیں، کتنی بڑی ہوتی ہے۔بہت چھوٹی ہوتی ہے، کتنی جلتی ہے، تھوڑی سی جلتی ہے، پورے مکان کو اور پوری مجلس کو اور تمام لوگوں کو وہ خوشبو مہیا کرتی ہے۔

تو میں کہہ رہا تھا کہ۔بہت زیادہ باتوں کی کیا اہمیت ہے؟ دُنیا میں کتابوں کی کمی نہیں ہے،۔بہت کتابیں ہیں بہت کتابیں ہیں۔اگر اتفاق سے اس میں کوئی ایسی بات ہے جو پیغمبر کی ہو، یا کسی امام کی، یا کسی پیر بزرگ کی تو ٹھیک ہے۔نہیں تو انہوں نے کہاں سے علم حاصل کیا، کون سا سرچشمہ ہے؟ کون سا خزانہ ہے، کون سا وسیلہ ہے؟ کوئی نہیں، کچھ نہیں۔تو کیا ایسی باتوں کا نام ہم علم رکھ سکتے ہیں، ان باتوں کو علم قرار دے سکتے ہیں؟ نہیں، تو دُنیا کے اندر علم دو قسم کا ہے، ایک علم صحیح علم ہے، ایک علم دھوکے کا ہے، لوگوں نے اس کا نام علم رکھا ہے۔اس کے لینے میں نقصان ہے، آٹے کے نام سے اگر ایسی کوئی چیز جس میں بہت زیادہ ملاوٹ ہو یا اس کو آٹے کی شکل وصورت دی گئی ہو، کیا اس کے کھانے سے غذائیت حاصل ہوگی؟ جہاں [یا] جس ملک میں ملاوٹ ہوتی ہے تو اُس ملک کے لوگ۔بہت ہی کمزور اور صحت کے لحاظ سے گرے ہوئے ہوتے ہیں۔کیوں؟ ان کو دھوکا ہوگیا اور اصلی چیز کے نام پر نقلی چیز فروخت ہونے لگی۔سکّے کو لیں، کسی اور چیز کو لیں اور ہر چیز میں جب ملاوٹ ہوتی ہے تو اس سے بجائے فائدے کے نقصان ہوتا ہے۔اسی طرح اگر علم، صحیح علم نہیں ہے اور علم کے نام پر خواہ مخواہ کی باتیں ہیں تو اس سے۔بہت نقصان ہوتا ہے،۔بہت نقصان ہوتا ہے تو اُس کی صفائی کے لئے ہر زمانے میں نظامِ ہدایت اور نظامِ علم کے افراد ہوتے ہیں وہی ہم کو بتا سکتے ہیں کہ علم کونسا ہے اور جہالت کونسی ہے؟ اِس کے لئے کمرِ ہمت باندھنا چاہئے، حقیقی علم کو حاصل کرنا چاہئے اور نہ صرف ذاتی طور پر علم حاصل کرنا چاہئے بلکہ جماعت کو علم کا فائدہ دلانا چاہئے۔آپ بعض دفعہ یہ سوچتے ہوں گے کہ ہم نہ تو واعظین ہیں نہ عالم ہیں۔ہم اِس علم کو کیا

کریں گے، اگر کوئی ایسا خیال ہے تو وہ اوّل تو فضول ہے، صحیح نہیں ہے۔ دیکھئے، آپ پوری زندگی کا تصوّر کریں، پوری زندگی میں آپ کتنے افراد سے ملیں گے، اگر آپ کے پاس علم ہو اور ساتھ ساتھ ہر موقع پر تھوڑا تھوڑا علم دینے کا جذبہ بھی ہو تو آپ زندگی میں بہت سے افراد کو علمی فائدہ پہنچا سکیں گے۔ اپنوں سے لے کر بیگانوں تک اور ہر وقت علم کی خوشبو پھیلا سکیں گے اور گنتی کے لحاظ سے اگر آپ لیں تو زندگی کے آخری وقت تک آپ ہزاروں کو بلکہ لاکھوں کو فائدہ پہنچا سکیں گے۔ تو کیا آپ اس فائدے کو خاطر میں نہیں لاتے ہیں، صرف یہ دیکھتے ہیں کہ ایک وقت میں سامنے اجتماع کتنا بڑا ہوتا ہے اور ہم کو کتنی بڑی مجلس میں بولنے کا موقع ملتا ہے، آپ اس نظریے سے دیکھتے ہیں، اِس میں دانشمندی نہیں ہے۔ اِس کے علاوہ آپ اپنی اولاد [کے بارے میں] بھی سوچیں اور اپنے خاندان [کے بارے میں] بھی سوچیں اور اپنی رُوح [کے بارے میں] بھی سوچیں، انفرادی طور پر بھی علم کی ضرورت ہے۔

اِس مثال سے آپ کو علم کی اہمیت ظاہر ہوئی ہوگی تو لہٰذا آپ خود کو تیّار کریں۔ علاوہ ازیں ایک اور ضرورت یہ بھی ہے کہ آج کل ہماری جماعت کے اندر علم کی بہت بڑی ضرورت ہے۔ ایک اِس لئے کہ کچھ دُوسروں کی باتیں ہمارے درمیان آرہی ہیں اور اِس لئے بھی کہ زمانے میں لادینیت پھیل رہی ہے اور اِس لئے بھی کہ ظاہری فلسفہ بہت قوی اور مضبوط ہو چکا ہے۔ اس کا بھی کوئی اثر ہے، اس کا بھی کوئی تقاضا ہے۔ جب دُنیا بہت مضبوط ہو جاتی ہے تو دین کو لوگ نظر میں نہیں لاتے ہیں۔ یعنی جب ظاہری سائنس اور ظاہری علوم کی اتنی ترقی ہے تو اُس کا اِس پر اثر پڑتا ہے، سوالات اُبھرتے ہیں۔ کالج، یونیورسٹی میں جانے والی نسل شکوک وشبہات کی شکار ہو جاتی ہیں، اور پھر اِس سے دین میں خلل پڑتا ہے۔ اس کے لئے بھی ضرورت ہے کہ اس وقت زیادہ سے زیادہ علم پر زور دیا جائے اور علم کو تحریر اور تقریر میں عام کیا جائے۔ تو آپ سمجھتے ہیں کہ [اِس] زمانے میں اگلے زمانے سے کہیں زیادہ علم کی ضرورت ہے، اس کی بہت بڑی اہمیت ہے۔ اس لئے خصوصاً ہم آپ جو اس جمعیت سے منسلک ہیں، علم کا دعویٰ رکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم علم پھیلانے کے لئے ہیں، ہم دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم علمی طور پر انقلاب لائیں گے تو ان تمام ضرورتوں کے پیشِ نظر ہمیں علم سے زیادہ سے زیادہ خود کو آراستہ کرنا چاہئے اور علم کی طرف زیادہ سے زیادہ توجہ دینی چاہئے، اور اپنی معلومات کا جو ذخیرہ ہے اس میں زیادہ سے زیادہ اضافہ کرنا چاہئے۔

اسی کے ساتھ میں اپنی گفتگو کو ختم کرتا ہوں اور آخر میں ہم سب کو مل کر مختصر سی دعا مانگنی چاہئے کہ مولائے زمین و زمان اپنی بے پناہ رحمت سے اس مقدّس مجلس کے ہر فرد کو دین و دُنیا کی نوازشات سے نوازے اور دونوں جہان کی

صلاح وفلاح عنایت کرے، دونوں جہان کی سرخروئی اور سربلندی عطا کرے اور ہر طرح کی بلاؤں سے ان تمام عزیزوں کو محفوظ رکھے، سب مشکلات آسان ہو جائیں اور تمام نیک مرادیں پوری ہو جائیں اور زیادہ سے زیادہ امام کی فرمانبرداری نصیب ہو، مقدس مجلس سے وابستگی نصیب ہو، ہر فرد کی علم میں ترقی ہو، رُوحانیت میں ترقی ہو اور عقل و دانش میں ترقی ہو اور ہر فرد کو خداوند زیادہ سے زیادہ خدمت کی توفیق اور ہمت عطا فرمائے۔ [آمین! یاربّ العالمین!!]

ٹائپنگ: اکبر علی پروف: نسرین اکبر